عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

زیرِ ادارت سید نذیر نیازی

خاص عنوانات

بحضور رسالتمآب صلعم

حضرت علامہ اقبال مدظلہ' کی جدید فارسی
مثنوی کے ایک صفحے کا عکس

قرآن اور وطن
از ڈاکٹر میاں تصدق حسین "خالد"

مسئلۂ تحفظ اُردو

سیاحت اندلس
از مولوی غلام یزدانی' ایم- اے

ضرب کلیم پر ایک طائرانہ نظر

حدیث راز — ایک افسانہ

مصر و انگلستان کا جدید عہد نامہ

بغاوت اسپین

اور

میاں سر فضل حسین مرحوم' استنبول'
بحث و نظر وغیرہ

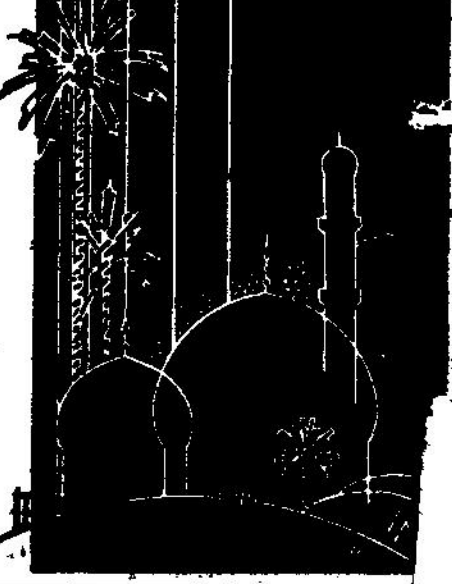

ستمبر ۱۹۳۶ء

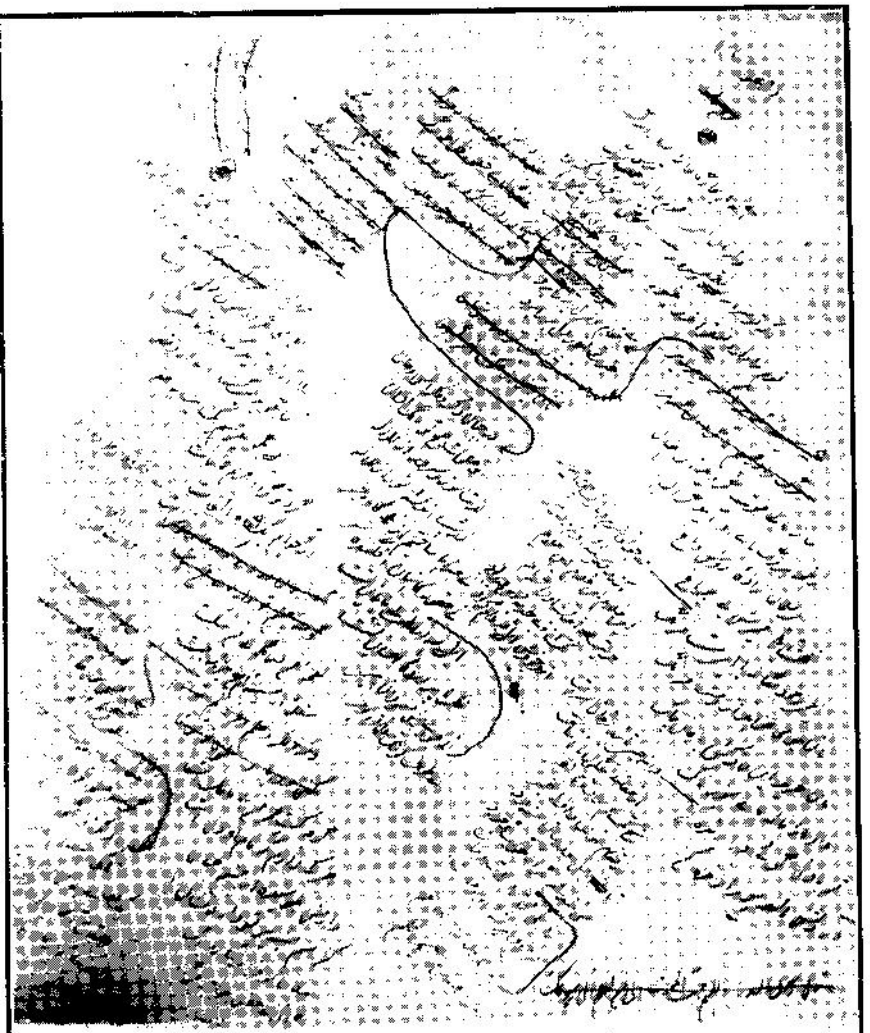

عکس: پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

کا ایک صفحہ

علامہ اقبال مدظلہ کی جدید فارسی مثنوی

فہرست

بحضور رسالتمآب صلعم

"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" علامہ اقبال مدظلہ کی جدید مثنوی کا ایک صفحہ

شانِ مسلم	جناب اسد ملتانی بی اے	۱
ضربِ کلیم	مولانا اسلم جیراج پوری	۴
تکلف برطرف	ادارہ	۳
لمعات	ادارہ	۵

مقالات

قرآن اور وطن	ڈاکٹر تصدق حسین خالد ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا،	۱۷
مسئلہ تحفظ اردو	سید نذیر نیازی	۴۴
اچھوتوں کا حل میرے مذہب میں	چودھری غلام احمد پرویز بی اے	۳۹
استقلالِ افغانستان	ادارہ	۴۵
سیاحت اندلس	مولوی غلام یزدانی ایم۔ اے، او، بی، ای ناظم محکمۂ آثارِ قدیمہ دولت آصفیہ	۴۹
ضربِ کلیم پر ایک طائرانہ نظر	پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایم۔ اے پرنسپل اشاعت اسلام کالج	۵۲
حدیثِ راز ــــ جمعیتِ آدم	راز داں	۷۵
ایک افسانہ ــــ باتونی	سید نصیر احمد بی۔ اے	۷۷
اور ــــ حرکت پیدا کیجئے	البرٹ موسئے اور ...	۷۴

جہانِ گزراں ۸۶

رجال و مشاہیر ــــ میاں سر فضل حسین مرحوم | تاریخ و سیاست ــــ مصر اور انگلستان کا جدید معاہدہ

آثار و مقامات ــــ استنبول | بین الاقوامی دنیا ــــ اسپین کی خانہ جنگی

بحث و نظر ۹۷

ہمارے معاصرین ــــ خاتم اور خاتم، اورنگ زیب کا عہد، اقبال

نقد و تبصرہ ــــ انجمن حمایت اسلام کا عکسی قرآن مجید، محمد النبی صلعم، اسلام اور اچھوت

شناختِ مہدی، مسلم انڈیا انشورنس کمپنی، معین الشفا وغیرہ

THE IQBAL ACADEMY KARACHI PAKISTAN

شانِ مُسلم

از جناب اسد ملتانی

دل اے مسلم! ترا اس عشق کا نخچیر ہو جائے
کہ جس سے کائناتِ دو جہاں تسخیر ہو جائے

ہے یہ بھی ایک مظہر رحمۃ للعلمینی کا
پھر اسلامی اخوت کیوں نہ عالمگیر ہو جائے

نبی کا اسوۂ حسنہ تجھے یہ درس دیتا ہے
کہ تیری زندگی قرآن کی تفسیر ہو جائے

مسلمانوں کی ذلت دیکھ کر دل کانپ جاتا ہے
کہیں دنیا میں دینِ حق نہ بے توقیر ہو جائے

تری کوتاہیوں سے قولِ حق پر حرف آتا ہے
دعائے مردِ مومن اور بے تاثیر ہو جائے

دکھا وہ گرمیٔ رفتار میدانِ محبت میں
ترے نقشِ قدم کی خاک بھی اکسیر ہو جائے

وہ تسلیم و رضا جس سے عمل میں جان پڑتی ہے
قیامت ہے کہ تیرے پاؤں کی زنجیر ہو جائے

تری یہ شان ہو دنیا میں اے اللہ کے نائب
تری تدبیر دست و بازوئے تقدیر ہو جائے

اسد۔ ایسا مصنف کم نہیں مردِ مجاہد سے
کہ جس کے ہاتھ میں آ کر قلم شمشیر ہو جائے

تکلف برطرف

'اسلامک ریویو' اشاعت جولائی میں سر جلال الدین برٹن کا ایک مضمون بعنوان "دنیائے اسلام کی موجودہ صورت حالات" چار صفحوں (۲۶۲ - ۲۵۸) میں شائع ہوا ہے۔ اگر نصف صفحہ تمہید اور نصف اختتام کے لئے چھوڑ دیا جائے تو باقی صرف تین صفحات رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان میں سے بھی ایک یعنی صفحہ ۲۶۲ تمام و کمال علامہ اقبال مدظلہ کے انگریزی خطبات 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' سے اس طرح ماخوذ ہے کہ اس پر تلخیص کا شبہ ہوتا ہے نہ اقتباس کا۔ اس حیرت انگیز توارد یا کی اطلاع ہمیں ایک انگریز مصنف سے ملی۔ دوسروں کے خیالات کو تھوڑی بہت ترمیم یا ردوبدل سے "اپنا لینا" ایک مستقل فن ہے لیکن تشکیل جدید کے ایک پورے صفحے کی ڈکیتی سر برٹن ہی کے حصے میں آئی تھی۔ ہم اس غیر معمولی جرأت پر ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مدیر لائٹ کی تجویز ہے کہ مسلمانانِ ہند مسٹر محمد علی جناح کو اپنا امیر منتخب کریں۔ وہ فرماتے ہیں اس منصب کے اہل مولانا ابوالکلام تھے لیکن جیسا کہ سبکو معلوم ہے ان کی رائے میں ابھی امارت کا قیام مصلحت وقت کے منافی ہے ان کے بعد اگرچہ ہماری نگاہیں قدرتاً علامہ اقبال کی طرف اٹھتی تھیں مگر بدقسمتی سے ان کی صحت ٹھیک نہیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ فی الحال امارت مسٹر جناح کی خدمت میں پیش کئے جائیں اسلئے کہ سیرت بہ کیف مذہب اور اخلاص ڈاڑھی سے بہتر ہے بجا ارشاد ہوا مگر سوال یہ ہے کہ آیا مدیر لائٹ بھی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں یا نہیں۔ پیغام صلح کی اشاعت اگست، ۴۳ء میں بعنوان "مولانا ابوالکلام آزاد اور امارت" ایڈیٹر صاحب نے جناب عزیز ہندی کو پند و نصیحت کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ امام زماں حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف رجوع کیجئے۔ مسلمانوں کی تمام مشکلات کا حل آپ کو حضرت مرزا صاحب کی کتب میں مل جائیگا۔ ان کا مطالعہ کیجئے۔ "یہ امارت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا۔"

معلوم ہوتا ہے۔ ایڈیٹر لائٹ کی نظر سے پیغام صلح کی یہ تصریحات نہیں گذریں ورنہ وہ اس مسئلے پر قلم اٹھانے سے پہلے حضرت مرزا صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتے یا بہت ممکن ہے ایڈیٹر لائٹ کو صرف تفریح طبع مقصود ہو۔ لیکن ایڈیٹر لائٹ حضرت مرزا صاحب، امارت اور تفریح طبع عجب معاملہ ہے!

فنانشل ٹائمز لندن میں ایک صاحب آٹولائیکس لکھتے ہیں:۔ کل ایک کاغذ میری نظر سے گذرا جس پر آنسوؤں کے نشانات کے ساتھ ذیل کی عبارت درج تھی

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کل آبادی	۱۲،۵۰،۰۰،۰۰۰
تجویز ٹاؤنسنڈ کی رو سے	
پیرانہ سالی کی پنشن کے حقدار	۵،۰۰،۰۰،۰۰۰
نابالغ جو قوانینِ محنت اطفال	
کے ماتحت کام کرنے سے عاری ہیں	۶،۰۰،۰۰،۰۰۰
بیروزگار حسب تخمینہ فادر کف لن	۱،۴۹،۹۹،۹۹۸
میزان کل	۱۲،۹،۹۹،۹۹۸

باقی صرف دو بچے۔ گویا اس بارہ کروڑ سے زائد آبادی میں دو آدمی ہیں جن پر ملک کی تمام ضروریات کی پیداوار کا انحصار ہے یعنی میں اور تم۔ لیکن میں؛ میں تھک گیا ہوں!

مصر اور انگلستان کے جدید معاہدات پر تبصرہ کرتے ہوئے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے لکھا ہے کہ بالآخر اٹلی کے خوف نے مصریوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ انگریزوں سے عہدِ مودت استوار کر لیں۔ اب کسی شخص کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوگی کہ سرزمین مصر سے انگریزوں کا رابطہ اتحاد اٹلی کی طاقت اور فتحمندی کا نتیجہ ہے۔

ادارہ

حضرت علّامہ ڈاکٹر سر محمّد اقبال مدّظلّہٗ

کی

جدید فارسی مثنوی

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"

اور

مسافر

(زیرِ طبع)

ہر دو مثنویاں یکجا اور مجلّد شائع ہونگی

صرف

کتاب خانہ طلوعِ اسلام، ۲۵- میکلوڈ روڈ لاہور

سے

طلب فرمائیے

فرمائشیں ابھی آنا چاہئیں ورنہ طبعِ ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا

ضربِ کلیم

"ضربِ کلیم موصول ہوئی مجھے کس قدر خوشی ہوئی اور . . . اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام میرے لئے غذائے روح ہے اور میں ان کو ان سب شعرا سے افضل تر سمجھتا ہوں جو آج تک دنیائے اسلام میں ہوئے ہیں۔

آپ نے ریویو کی فرمائش کی ہے مگر میں نے آنکھوں کی تکلیف اور نگاہ کی کمزوری کے باعث مضمون نویسی بالکل چھوڑ دی ہے . . . . یہ دو شعر البتہ پیش کرتا ہوں مناسب معلوم ہو تو ان کو طلوعِ اسلام میں شایع کر دیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذر جائیں اور ساری "اقبالی" برادری کی نظر سے بھی۔

ضربِ کلیم ہم نے تو دیکھی نہیں مگر
سنتے ہیں اسکے ڈر سے دلِ کوہ خون تھا
اقبال کا قلم بھی عصائے کلیم ہے
اعجاز جس کا "تلقفُ مَا یافکون" تھا

مولانا اسلم جیراج پوری

تکلف برطرف

'اسلامک ریویو' اشاعت جولائی میں سر جلال الدین برٹن کا ایک مضمون بعنوان "دنیائے اسلام کی موجودہ صورت حالات" چار صفحوں (۲۵۸ - ۲۶۲) میں شائع ہوا ہے۔ اگر نصف صفحہ تمہید اور نصف اختتام کے لیے چھوڑ دیا جائے تو باقی صرف تین صفحات رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان میں سے بھی ایک یعنی صفحہ ۲۶۲ تمام و کمال علامہ اقبال مدظلہ کے انگریزی خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے اس طرح ماخوذ ہے کہ اس پر تلخیص کا شبہ ہوتا ہے نہ اقتباس کا۔ اس حیرت انگیز "توارد" کی اطلاع ہمیں ایک انگریز مصنف سے ملی۔ دوسروں کے خیالات کو تھوڑی بہت ترمیم یا رد و بدل سے "اپنا لینا" ایک مستقل فن ہے لیکن تشکیلِ جدید کے ایک پورے صفحے کی ڈکیتی سر برٹن ہی کے حصے میں آئی تھی۔ ہم اس غیر معمولی جرأت پر ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مدیر لائٹ کی تجویز ہے کہ مسلمانانِ ہند مسٹر محمد علی جناح کو اپنا امیر منتخب کر لیں۔ وہ فرماتے ہیں اس منصب کے اہل مولانا ابوالکلام تھے لیکن جیسا کہ سب کو معلوم ہے ان کی رائے میں ابھی امارت کا قیام مصلحت وقت کے منافی ہے۔ ان کے بعد اگرچہ ہماری نگاہیں قدرتاً علامہ اقبال کی طرف اٹھتی تھیں مگر بدقسمتی سے ان کی صحت ٹھیک نہیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ فرائضِ امارت مسٹر جناح کی خدمت میں پیش کئے جائیں اس لئے کہ سیرت بہرکیف مذہب اور اخلاص ڈاڑھی سے بہتر ہے بجا ارشاد ہوا مگر سوال یہ ہے کہ آیا مدیر لائٹ بھی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں یا نہیں۔ پیغام صلح کی اشاعت اگست، ۲۲-۳ میں بعنوان "مولانا ابوالکلام آزاد اور امارت" ایڈیٹر صاحب نے جناب عزیز ہندی کو پند و نصیحت کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ "آپ امام زماں حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف رجوع کیجئے۔ مسلمانوں کی تمام مشکلات کا حل آپ کو حضرت مرزا صاحب کی کتب میں مل جائیگا۔ ان کا مطالعہ کیجئے۔ یہ امارت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا۔"

برس کے بعد ضربِ کلیم کی اشاعت سے پورا ہوا۔ بالِ جبریل میں بھی اندازِ سخن کی ایک حد تک یہی کیفیت تھی مگر اس میں فارسیت کا پرتو موجود ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ضربِ کلیم کی سادگی۔ اسکے بیساختہ پن اور بے تکلف طرزِ ادا اور حقائق کے صاف صاف اور واضح اعتراف سے حماسہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حماسہ اور ضربِ کلیم کا موضوع ایکدوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسوقت اس صاف و صریح اور بے تکلف طرزِ ادا کی ضرورت بھی تھی لیکن یہ بجائے خود ایک مستقل بحث ہے جس سے اس مختصر سے تبذرے میں عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے۔ سرِ دست ہم جناب پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی کا ایک مضمون شائع کر رہے ہیں جو گویا ضربِ کلیم کا تعارف نامہ ہے۔ اسکے مطالب و معانی اور دوسرے مباحث کے لئے طلوعِ اسلام کی آیندہ اشاعتوں کا انتظار کرنا چاہئے۔

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کن تاثرات کا نتیجہ ہے اور اس میں کن امور پر بحث کی گئی ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ایک مختصر سی تمہید اور 'خطاب بہ مہرِ عالمتاب' کے بعد حکمت کلیمی' حکمت فرعونی' اسرارِ شریعت' لا الٰہ الا اللہ' سیاستِ حاضرہ' اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں' خطاب بہ امت عربیہ اور پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کے مختلف اور متعدد عنوانات کے ماتحت مشرق یا بالفاظِ دیگر عالمِ اسلام کے تمام مسائل پر جو حبشہ کی تباہی کے ساتھ دفعتہً ہمارے سامنے آگئے ہیں ایک سبق آموز تبصرہ موجود ہے۔ نظم کا خاتمہ حضور سرورِ کائنات صلعم کی خدمت میں ایک عرض ہوتا ہے جسکا ایک صفحہ حضرت علامہ کی خاص عنایت سے اس اشاعت میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ احباب کو یہ سنکر اور بھی زیادہ مسرت ہوگی کہ مسافر جسکے بہت کم نسخے طبع اول پر ہندوستان میں فروخت ہوئے تھے۔ اس مثنوی کے ساتھ مکرر شائع ہو رہی ہے۔

بے محل اعتقاد اور بے محل نتائج

قارئین طلوعِ اسلام کو یاد ہوگا کہ آخر جولائی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان قادیانیت کے متعلق شائع ہوا تھا جس میں اس نہایت ہی غلط اور باطل عقیدے کی تردید کی گئی تھی کہ مسلمانوں کا اپنی نجات و سعادت کے لئے کسی "مسیح موعود" یا "مجدد" پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مولانا بروئے احادیث صرف اس بات کے قائل ہیں کہ ابنِ مریم کا نزول علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ ایک مخلص اور دیانت دار مسلمان کے لئے جو اس حقیقت کو سمجھ گیا ہے کہ اسلام کے پیشِ نظر جو مقصد ہے اس کی موجودگی میں حیات و وفاتِ مسیح یا مجددیت

محدثیت کے "مسائل" پیدا ہی نہیں ہوتے اگرچہ مولانا کا یہ ارشاد بہت کافی تھا لیکن جن حضرات کی یہ آرزو ہیں ہوں کہ احکامِ قرآن کی پابندی اور اتباعِ سنت کے صاف اور سیدھے راستے کو چھوڑ کر محض خیالات و مزعومات کی بنا پر اسلام کے اندر نئی نئی ملتیں، قومیں اور جماعتیں پیدا کریں تاکہ زندگی اور اس کے حقائق سے مزار کی کوئی صورت نکل آئے وہ اس امر پر کس طرح راضی ہو سکتے تھے کہ تاویلات و اجتہادات کا جو طومار برسوں کے کد کے بعد انہوں نے طیار کر رکھا ہے اسے یک قلم خیرباد کہہ دیں۔ اسی سلسلے میں "قادیانیوں" کا تذکرہ بے سود ہے۔ اس لئے کہ وہ دانستہ یا نادانستہ بتدریج ایک نئی شریعت اور نیا مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ افسوس جماعت لاہور کے طرزِ عمل پر ہے۔ جسے دیکھ کر چار و ناچار مولینا ابوالکلام کی اس تشخیص کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان حضرات کو جو ٹھوکر لگی ہے اس بے محل اعتقاد سے جو انہیں مرزا صاحب کی ذات سے ہے البتہ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس بے محل اعتقاد کے نتائج اور بھی زیادہ بے محل ہونگے۔ بجائے اس کے کہ جماعتِ احمدیہ لاہور اسلام کے روحانی اور اخلاقی مقاصد پر غور کرتے ہوئے اس امر کو سمجھنے کی کوشش کرتی کہ مرزا صاحب کے اجتہادات سراسر غلط اور ان کا دعویٰ محض اپنے مظنونات کا نتیجہ تھا کبھی اعلان کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر سر اقبال احادیث کے منکر ہیں اور کبھی یہ کہ مولینا اپنی سابقہ تحریروں سے منحرف ہو گئے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مذہب میں صلح جائز ہی نہیں وغیرہ وغیرہ یہ کہ مولینا اپنی سابقہ تحریروں سے منحرف ہو گئے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مذہب میں صلح جائز ہی نہیں وغیرہ وغیرہ پیغامِ صلح کی مختلف اشاعتوں میں یہ اور اس قسم کی سینکڑوں تحریریں ہر روز دیکھنے میں آتی رہتی ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ اس اندازِ تنقید کے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ بحث و استدلال یا پراپیگنڈا؟ حالانکہ اول الذکر یعنی تحقیق و تجسس کے لئے علم و فضل اور غیر جانب داری کے علاوہ مسائل کا صحیح فہم شرط ہے اور موخر الذکر یعنی پراپیگنڈا تو اخلاص و دیانت دونوں سے بعید ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ معاملہ یہ نہیں بلکہ جماعتِ احمدیہ کی ساری مشکلات اس بے محل عقیدے سے مترتب ہوتی ہیں کہ مرزا صاحب کی ذات قرآن و سنت کی حامل اور اتباعِ شریعت کا نمونہ تھی اور آنحضرت صلعم کے بعد اگر کسی نے اسلام کو سمجھا ہے تو مرزا صاحب نے۔ لہٰذا اگر کوئی جماعت اس قسم کا اعتقاد قائم کر سکتی ہے تو اس کے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کیا مشکل ہے کہ چودھویں صدی ہجری میں سارا اسلام سمٹ کر مرزا صاحب کے وجود میں جمع ہو گیا اور ان کے پیرو یعنی جماعتِ احمدیہ لاہور اس وقت تمام دنیا میں تمسک بالدین، عشق قرآن اور زکوٰۃ و صلوٰۃ کی تنہا اجارہ دار ہے۔ نہ اس کا کوئی خیال غلط ہے نہ طرزِ عمل مشکوک۔ کیا اچھا ہو اگر مدیر پیغام صلح اس آخری قضیے پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں

وہ امیر جماعت احمدیہ کے اس نئے اجتہاد کا مطلب سمجھنے کی بھی کوشش کریں کہ "مدعی نبوت کاذب ہے مگر اس کے ماننے والے نہیں۔" ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا لیکن اگر جماعت قادیان ان کی مستقل نبوت پر مصر اور اس کا انکار کرنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرتی ہے تو مولانا محمد علی صاحب کو ان کی وکالت کی کیا ضرورت پیش آئی؟ ہماری رائے میں جماعت احمدیہ لاہور کو اس امر کا اعلان کر دینے کے بعد کہ مرزا صاحب کا اقرار یا انکار "شرائط ایمان" میں داخل نہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے قوائے ذہنی اور عملی قوتوں کو چند خیالی مخصوص میں ضائع کر دے مثلاً یہ کہ بمصداق آئیہ کریمہ کونوا مع الصادقین مجددین کا ماننا ضروری ہے۔ یا بروئے حدیث ان اللّٰہ یبعث علی راس کل مائۃ ..... الخ) مجدد کا ظہور اور اس کی تلاش فرض ہے۔ وفات وحیاتِ مسیح اور نزولِ ابن مریم یا مثیل ابنِ مریم کا فیصلہ ابھی کر لینا چاہئیے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو معلوم نہیں دین میں کیا رخنہ پیدا ہو جائے ہم اس کے خلوصِ نیت اور صدق دلی پر اعتراض نہیں کرتے۔ ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد کسی شخص کے متعلق شرائط ایمان یا انکار و اقرار کا ذکر اور یہ نمازوں سے پیشتر اس کی تصدیق و تکذیب کا سوال کہاں تک جائز ہے؟ کیا وہ نعوذ باللہ شریک فی الرسالت ہے کہ اس کے صدق و کذب کو عملاً دین کا ایک رکن تصور کر لیا جائے۔ آج کل پیغام صلح کا سارا زورِ قلم اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ مجددین کا ماننا ضروری ہے۔ بہت بہتر مگر اس امر کے متعلق کیا ارشاد ہے کہ نزول قرآن اور بعثت محمدیہ کے بعد کسی مسلمان کو خواہ اس کا مرتبہ کچھ بھی ہو یہ حق نہیں پہنچتا کہ امت کے غلط و صواب یا اتحاد و تفریق کی بنا اس کی ذات پر رکھی جائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ مدیر پیغام صلح اپنے بیجا طرزِ عمل کی حمایت میں عقل اور منطق کا غلط استعمال کریں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مدیر پیغام صلح اور ان کے ساتھ ساتھ تمام جماعتِ احمدیہ اپنے خیالات کی غلطی کا اقرار کرے۔

انجمن خواتین اسلام

انجمن خواتین اسلام یا مسلم ویمنز کانفرنس نے محترمہ خدیجہ بیگم فیروز الدین صاحبہ ایم۔اے سرکل انسپکٹرس مدارس بنات کی نگرانی میں اصلاحِ معاشرت کا جو بیڑا اٹھایا ہے اسکی طرف ہم طلوع اسلام کی پچھلی اشاعت میں اشارہ کر چکے ہیں۔ جہاں تک ہمیں اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر غور کرنے کا موقعہ ملا اور جس حد تک ہم نے اس کی کارروائیوں کا مطالعہ کیا ہم نہایت مسرت سے اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادیٔ نسواں کی جو تحریک تہذیب مغرب کے زیر اثر آج کل اس ملک میں رونما ہے اس کے برعکس انجمن خواتین اسلام کی نظر اسلامی اخلاق کی حفاظت اور اتباع شریعت پر

ہے اور یہ خدا کا فضل ہے کہ اسکے سب عہدیداروں کے دل میں غیرتِ ملی اور حمیتِ اسلام کا جذبہ موجزن ہے۔ اس عظیم الشان خدمت کے لئے مسلمانانِ پنجاب کو محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ کا ممنون ہونا چاہیئے جن کے فیضِ تربیت نے ہماری بہنوں کے اندر ناموسِ دین کی حفاظت کا ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور اجتماعی ماحول میں جب کوئی تہذیب اندرونی مفاسد یا خارج کے ناگوار اثرات سے محفوظ نہیں، ہمارے لئے جماعتی استحکام کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی رائے عامہ کی تربیت۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انجمن خواتینِ اسلام کا خیر مقدم کرتے ہوئے صدقِ دل سے اس امر کے آرزومند ہیں کہ وہ تعلیم و تربیت اور اصلاحِ معاشرت کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاسی ضروریات میں بھی نسائے اسلام کی رہنمائی کرے۔ مغربی تعلیم نے سب سے پہلے نوجوانوں کی ذہنیت کو خراب کیا اور پھر اُن نوجوانوں نے قوم کی اصلاح اور ترقی کے نام پر تعلیم نسواں کی ابتدا کی جس سے ہماری عورتوں کی فطرت مسخ ہونے لگی۔ پچھلی صدی میں جب علی گڑھ کی تحریک عام ہوئی تو کسے خیال تھا کہ جدید تعلیم کا رواج مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اس قدر مضر ثابت ہوگا۔ اور اسوقت جب نئے دستور کا مطالبہ یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی مجالسِ قوانین میں سیاسی اور معاشی معاملات پر بحث کریں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے نتائج کیا ہونگے۔ پیرِ مغرب کا ارشاد یہ ہے کہ تہذیب و ترقی کا راز مرد و زن کے باہمی اختلاط اور سیاست و معیشت میں ان کی یکجا شرکت میں مضمر ہے۔ برعکس اس کے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے اور یورپ کے موجودہ حالات نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے۔ لیکن اگر جدید دستور عورتوں کے حق رائے دہندگی اور حق نیابت پر مصر ہے اور دردمندانِ ملک و ملت کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تو کس کی ہمت ہے کہ اس صورتِ حالات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے کاش اس وقت لسان العصر مرحوم زندہ ہوتے اور ان کا معجز نما قلم اس جدید معاشرت کی تصویر کھینچتا جس میں ہماری بہنیں ایوانِ مجالس کے اندر صدارت و وزارت، مخالفت، قیادت اور وکالت کے فرائض انجام دیں گی ایوان سے باہر سیاسی جماعتیں منظم کریں گی۔ انتخابات میں حصہ لیں گی اور اپنے حقوقِ نیابت کو منوانے کے لئے حلقہ ہائے انتخاب کا دورہ کریں گی۔ لاہور میں اس قسم کا ایک چھوٹا سا ڈرامہ اس وقت بھی اسٹیج ہو رہا ہے جس میں خدا یان ملک و ملت کے ایک گروہ کا پارٹ اور بھی زیادہ دلچسپ (یا افسوسناک) ہے مگر کسے جرأت ہے کہ اس ایکٹنگ کے خلاف لب کشائی کرے اور لوگوں سے ذلالت پرستی یا تاریک خیالی کے طعنے سنے۔ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اگر جدید دستور کے ماتحت مجالس میں عورتوں کا داخلہ ناگزیر ہے تو ہمیں اور کچھ نہیں اتنا ہی کرنا چاہیئے

کہ قرآن اور شریعت کے استخفاف واستہزار کی بجائے خدمتِ اسلام کا صحیح راستہ اختیار کریں اور ان معزز خواتین کی بے جا مخالفت سے محترز رہیں جو اگرچہ آپ سے متفق نہیں لیکن جو اس کے باوجود انتخاب کے ہنگاموں سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتیں۔

فرقہ دارانہ فیصلہ —— اور سیاساتِ وطنی

کچھ دنوں سے کانگریس یا بالفاظ دیگر ہندوں نے فرقہ دارانہ فیصلے کے متعلق جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ اس قدر پر لطف اور مضحکہ انگیز ہے کہ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ عام ہندو ذہنیت جو وسعت درواداری سے بے خبر کسی معاملے میں جرأت وہمت یا ایثار و فیاضی سے کام ہی نہیں لے سکتی اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ اقوام ہند کے باہمی اتحاد یا ان کے سیاسی اور معاشی ارتقا کے لئے حکومت کے صادر کئے ہوئے فیصلے کے برعکس جس "آزادی اور آزادانہ" تصفیے کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے اس کی اگر کوئی صورت ہے تو مسلمانوں سے گفت و شنید نہ کہ انٹی کمیونل ایوارڈ کانفرنسوں کا انعقاد یا جذبات تعصب و منافرت سے بھرے ہوئے محضر نامے۔ باوجود ذہانت اور دانشمندی کے ہندو من حیث القوم اپنی اس خواہش کو پوشیدہ نہیں رکھ سکے کہ فرقہ دارانہ فیصلہ کی تنسیخ سے ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اقلیتوں کا معاملہ ان کے سپرد کر دے۔ کانگریس جو سیاسی جوڑ توڑ اور ڈپلومیسی میں قدرے ہوشیار واقع ہوئی ہے اکثریت کے تغلب کو جمہوریت اور قومیت کی فریب آلود اصطلاحوں میں چھپاتی ہے۔ اس کا یہ اعتراض کس قدر عجیث غریب اور حقیقت سے بعید ہے کہ فرقہ دارانہ فیصلہ آئین جمہوریت کے منافی ہے۔ ذرا خیال تو فرمائیے یہ الفاظ ان لوگوں کے منہ سے نکل رہے ہیں جن کی ساری تہذیب جماعتی تشدد، ناانصافی، عدم مساوات اور تنگ دلی کی تصویر ہے اور جو خود اپنی قوم کے اندر ابھی اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اتحاد و اتفاق یا جمہوریت کا تقاضا کیا ہے۔ اگر مسلمان اس بات پر آمادہ نہیں کہ ہندو اور مسلمان انگریزوں یا فرانسیسیوں کی طرح ایک قوم بن جائیں (اور نہ کبھی بن سکیں گے) تو کانگریس کا کیا حق ہے کہ فرقہ دارانہ فیصلے کو جمہوریت پسندی کے خلاف ٹھہرائے۔ یقیناً جمہوریت کا مطالبہ یہ نہیں کہ اس ملک کی اکثریت اقلیتوں کے جائز حقوق کو نظر انداز کر دے۔ رہا سیاسی اور معاشی مصالح کے اشتراک کا عذر سو اس اشتراک کا ہندوؤں نے اپنی عملی زندگی میں جو ثبوت دے رکھا ہے اس کے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے لیکن اگر بفرض محال اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ہندو اس اشتراک کو غصب و اجارہ داری کی بجائے باہمی تعاون انصاف اور یگانگت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو اس سے کہاں لازم آتا ہے کہ مسلمان قومیت و وطنیت کے خالی از معنی تصورات کو ہندوستان کی آزادی

کا آخری ذریعہ سمجھ لیں۔ اس پر لطف یہ کہ اتحاد و اتفاق اور قومیت و وطنیت کا یہ سارا شور و غل صرف الفاظ تک محدود ہے۔ اتحاد و یک جہتی کے نام پر جذبات غیظ و غضب اور جوش و خروش کا اظہار اور اس سے یہ توقع کہ اس طرح مسلمان 'قوم پرستی' کے دائرے میں آجائیں گے کانگریس ہی کے حصے میں آیا تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہندو ایک متعصبانہ، علیحدگی پسند اور تنگ نظر معاشرت کے قائل ہیں۔ جو لوگ خود اپنی جاتی میں ایک دوسرے سے اخوت و مساوات کا برتاؤ نہیں کر سکتے انہیں کیا معلوم کہ دوسروں کے خیالات و مقاصد کا احترام اور ان کیلئے جذبات وسعت اور رواداری یا اشتراک و تعاون کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے۔ کیا کانگریس اس امر کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس نے اس صورت حالات کو بدل دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو کتنے بڑے آزاد خیال اور وسیع المشرب انسان ہیں۔ اور معاشی مصالح کے اشتراک پر کس قدر زور دیا کرتے ہیں۔ لیکن پنجاب کے قرضوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ یہی کہ اس مسئلے کو فریقین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر پنڈت جی اتنے بڑے اشتراکی اور اشتمالی کی رائے معاشی معاملات میں یہ ہے تو عام ہندوؤں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے کیا توقع کی جا سکتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ فرقہ وارانہ فیصلہ نہ آسمانی صحیفہ ہے نہ مسلمانوں کے لئے آزادی کا پروانہ۔ ہم یقیناً اس کی تبدیلی اور اس کی بجائے نشستوں کی تقسیم یا حقوق نیابت کی ایک بہتر تجویز بلکہ مخلوط انتخاب تک کے خواہشمند ہیں لیکن انصاف اور رواداری کی اساس پر مسلمانوں سے لڑنا انہیں بار بار فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے طعنے دینا اور حکومت سے دھمکیوں کے ذریعے یہ منوانے کی کوشش کرنا کہ فرقہ وارانہ فیصلے کی تنسیخ کا معاوضہ ہم اپنے تعاون اور اشتراک عمل سے ادا کر سکتے ہیں عقلمندوں کا کام نہیں۔ اگر کانگریس یہ سمجھتی ہے کہ دستور کے استرداد سے یہ فیصلہ خود بخود منسوخ ہو جائیگا تو ہمیں اس کی سادہ لوحی یا یوں کہئے کہ مجاہل عارفانہ پر ہنسی آتی ہے اسلئے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوؤں اور کانگریس کے اس مفاہمت ناپسند طرز عمل کا نتیجہ ہے جس کی بدولت گذشتہ دس پندرہ برس میں اتحاد و اتفاق کی تمام آرزوئیں بے کار ثابت ہوئیں اس فیصلے کی ترمیم کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو صرف ایک یعنی مسلمانوں کی تالیف قلب اور ان کے جائز مطالبات کا اعتراف

یہاں پہنچ کر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کی سیاسیات میں مسلمانوں کی روش کیا ہونی چاہئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کی محکومیت اور غلامی نے برادران وطن سے کہیں بڑھ کر مسلمانوں کی ہلاکت اور بربادی میں حصہ لیا۔ لہٰذا مسلمان اپنے مادی اور اخلاقی ارتقا میں دوسروں سے کہیں زیادہ آزادی کے محتاج ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس کے لئے کون سا ذریعہ اختیار کریں۔ ۱۹۲۰ء میں اتحاد و اتفاق اور خدمت وطن کے نام

پر جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ مسلمانوں کے سیاسی مقاصد اور ان کی آزادانہ ترقی میں فائدے کی بجائے نقصان کا باعث ہوئی۔ ہم نے اس حقیقت کو ایک نہیں کئی مرتبہ مختلف شکلوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کانگرس یا کانگرس سے متعلق جس قدر تحریکیں بحالت موجودہ اس ملک میں رائج ہیں، اُن کو اسلام اور اسلام کے اجتماعی نصب العین سے کوئی ہمدردی نہیں۔ بایں ہمہ ہم اقوام ہند کے ولولۂ آزادی اور جمہور کی سیاسی اور معاشی بیداری کی بڑھتی ہوئی رو کو کس طرح روک سکتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہمیں اس پر مسرت بھی ہوتی ہے اور ہمارا اس سے الگ رہنا بھی ناممکن ہے۔ بلکہ اپنے اندرونی اختلافات اور اکثریت کے غیر منصفانہ طرز عمل کے باوجود ہم نے ہمیشہ اس میں حصہ لیا اور لیتے رہیں گے۔ لہٰذا ہندوستان کی موجودہ سیاسیات میں ہمیں جرأت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو اس ملک میں طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں لیکن خطرات کا سب سے زیادہ مؤثر اور آزمودہ (جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے) علاج مسلسل عمل، بہادرانہ اقدام اور ہمت و استقامت میں مضمر ہے۔ دردمندانِ قوم کا بیشک یہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو غیر ضروری خطرات اور غلطیوں سے محفوظ رکھیں۔ انہیں اپنے حریفوں کی ہر حرکت کا علم ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جمود و تعطل کا راستہ اختیار کریں، جو دراصل موت اور بے حسی کا مرادف ہے اور جس کا نتیجہ گذشتہ دس برس کے متامل اور متذبذب طریق کار اور بزدلانہ مصلحت جوئی سے یہ ہوا کہ جمہور اسلام میں نفاق و انشقاق، بے معنیٰ اور بے محل جوش و خروش اور ایک غلط اور ریاکارانہ مذہبیت کا زور ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ عام مسلمان حقائق سے گریز کرتا ہے، اور اس کی بے عقلی اور کم نظری میں دن بدن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کیا ہمارے عجلت پسند رہنما جو بغیر کسی بصیرت کے ہر تحریک میں کود پڑتے ہیں قطع نظر اس سے کہ ملت کا مفاد اور اس کی مقتضیات کیا ہیں، علیٰ ہذا ہمارے مصلحت کوش بزرگ جن کا سارا وعظ و نصیحت بے عملی اور بے کاری پر ختم ہو جاتا ہے اس حقیقت پر غور فرمائیں گے کہ مسلمانوں کی یہ افراط و تفریط ان کے لئے کیسی کیسی آفات اور مصیبتوں کا باعث ہوئی ہے؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ جمہور اسلام جدید دنیا کے سیاسی اور معاشی عوامل کی کارفرمائی سے محفوظ رہیں گے یا ان کا اس وقت کی جماعتی قوتوں سے الگ رہنا فی الواقعہ ان کے حق میں اچھا ہوگا۔

لیکن جس طرح اس امر سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ مسلمانوں کا ان حالات سے الگ رہنا ناممکن ہے۔ اور ان میں حصہ لئے بغیر نہ اسلام کی کوئی خدمت انجام دی جاسکتی ہے نہ اپنی بعینہٖ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان صرف اسوقت تک مسلمان رہ سکتے ہیں جب اس کشمکش میں وہ اپنا راستہ خود متعین کریں۔ لیکن یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ اس لئے کہ اسلام کی نظر پہلے ہی سے ان مسائل پر ہے جس سے موجودہ دنیا اس وقت روشناس ہو رہی ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور ان کے جماعتی اقدامات کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامیہ کا مقصود و منتہا ہندوستان کے مخصوص حالات میں کیونکر پورا کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں جن وقتوں اور جن خطرات کا ذکر کیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ لیکن مسلمان بہ حیثیت مسلمان نہ قرآن و سنت کا دامن چھوڑ سکتے ہیں۔ نہ اسلام اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ وہ آزادی اور ترقی کی جدوجہد میں خاموش بیٹھے رہیں برعکس اسکے اسلام کا منشا ہی یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک برتر شعور اور ارتقائے ذات کے مختلف مظاہر کی طرف ہمیشہ بڑھتے رہنے کا ولولہ پیدا کرے۔ لہٰذا یہ وہ ذمہ داری ہے جس سے ہمارا اعراض کرنا گویا خود اپنے وجود اور اپنے مفاد سے غداری کرنا ہے۔

بغاوت اسپین اور فاشیت بمقابلہ اشتمالیت

پچھلے سال جب بال جبریل کی اشاعت پر علامہ اقبال مدظلہ کے ان تاثرات سے مستفیض ہونے کا موقعہ ملا ہے جو مسجد قرطبہ کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوئے تو اس وقت بار بار یہ شعر زبان پر آتا تھا

کونسی منزل میں ہے کونسی وادی میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

لیکن آج جبکہ اسلامی تہذیب و تمدن کا یہ وسیع گورستان بغاوت اور خانہ جنگی کا مرکز بنا ہے اور کچھ علم نہیں کہ مجاہدین مراقش جن کی آستینوں میں اندلس کے ایوانات اور مساجد کی کنجیاں ابھی تک موجود ہیں اپنی کوششوں میں کامیاب ہونگے یا ناکام کون کہہ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی فتح و نصرت کس راستے سے آئے گی لہٰذا تین برس پیشتر جب شاعر نے یہ کہا تھا تو کیا غلط کہا تھا کہ:-

آبِ رواں کبیر تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہ میں نہیں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

بہرکیف مسلمان اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام دنیا کے لئے فاشیت اور اشتمالیت کی یہ جنگ جس کے اثرات یورپ کی تہذیب و تمدن اور اس کے سیاسی روابط کے لئے غالباً بہت زیادہ وسیع اور دور رس ثابت ہونگے غیر معمولی دلچسپی اور غور و فکر کا باعث ہے۔ سوال یہ نہیں کہ آیا فیشطائی حکومت مسلمانانِ مراقش اور سرزمین اندلس میں اُن کی مذہبی آزادی کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے یا اشتمالی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانانِ مغرب اپنے جہادِ حریت میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا یورپ کے سیاسی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ بھی عبرت سے خالی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ مغرب کی مثال ایک پھوڑے کی سی ہے جس کا مادۂ فاسد اب ایک دوسرے کی نفرت اور بداعتمادی کی بجائے بغاوت اور خانہ جنگی کی شکل میں پھوٹ رہا ہے۔ یہ صورت حالات شاعر کے اس مُلہمانہ خیال کی کس قدر صحیح اور سچی تصویر ہے جس نے آج سے بہت پہلے دانایانِ فرنگ کو تنبیہ کی تھی کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ذاتیات:۔

طلوعِ اسلام کے دیرینہ عنایت فرما اور ہمارے محترم بزرگ جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے، او، بی، ای، ناظم محکمۂ آثارِ قدیمہ دولت آصفیہ، حیدرآباد (دکن) چار مہینے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے ہیں جہاں اُن کا بیشتر قیام غالباً آکسفرڈ میں رہے گا۔ دورانِ سفر میں اگرچہ مولوی صاحب موصوف کے لئے یہ ممکن نہیں کہ سیاحتِ اندلس کی اقساط بالالتزام بھیجتے رہیں لیکن اُن کا وعدہ ہے کہ قیامِ انگلستان میں بھی وہ طلوعِ اسلام کو فراموش نہیں کریں گے۔ ہم اس عنایت کے شکرگزار ہیں

اور دعا کرتے ہیں کہ انہوں نے جس مقصد کے لئے یہ سفر اختیار کیا ہے اس میں ہر طرح سے کامیاب ہو کر مع الخیر واپس تشریف لائیں۔ آمین۔

پچھلے دنوں ہمیں معاصر 'ٹروتھ' سے یہ سنکر بے حد رنج ہوا تھا کہ جناب ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے بعض مشکلات کی بنا پر 'ترجمان القرآن' کی اشاعت بند کردی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ ترجمان القرآن بفضلہٖ تعالیٰ پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور ہم بلاخوفِ تردید اس امر کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیمات قرآنی اور احکام شریعت کی تفسیر و تشریح کی جو عظیم الشان خدمت یہ ماہنامہ سرانجام دے رہا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر پیش کرنا ناممکن ہے۔ کیا اچھا ہو اگر مسلمانانِ ہند اس مفید اور متین پرچے کو مالی مشکلات سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز کردیں۔

ہمارے مکرم دوست جناب محمد اسد صاحب ملتانی کی رائے ہے کہ طلوع اسلام کی رعایت سے شذرات کی بجائے لمعات کا عنوان اختیار کیا جائے۔ ہم اپنے فاضل دوست کے اس مشورے کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

طلوع اسلام کا یہ نمبر دو ہفتے کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ لیکن یہ محض اس لئے کہ محکمۂ ڈاک کی ہدایت کے مطابق رجسٹرڈ نمبر کا مکرر اجرا ضروری تھا۔ ہم اس التوا کیلئے قدردانانِ طلوع اسلام کی خدمت میں کوئی معذرت پیش نہیں کریں گے۔ لیکن انہیں حقیقت حالات سے مطلع کر دینا بہرکیف ہمارا فرض تھا۔

قرآن اور وطن

ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی بیرسٹر ایٹ لا

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے اور اس کے انداز معاشرت کا تقاضا ہے کہ نوع انسانی کے ساتھ مروت و معاونت کی زندگی بسر کرے۔ لہٰذا اگر انسان کے لئے مدنیت و عمرانیت خاصۂ فطرت ٹھہرا تو باہمی حقوق اور ذمے داریوں کے تحفظ کے لئے آئین و ضوابط بھی لازمی ٹھہرے۔ یہی قوانین و دساتیر ہیں جو انفرادی زندگی میں سوسائٹی کی قیود اور اجتماعی زندگی میں بین الملی دستور العمل کہلاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کو قومی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قوم کی تعریف کیا ہے؟ اس کا جامع و مانع جواب آجتک مرتب نہیں ہو سکا۔ البتہ اس کا تصور پیش کرنے کے لئے ان عناصر ترکیبی سے بحث کی جاتی ہے جو کسی جماعت کی حیات ملیہ میں مشترک ہوں۔ ان عناصر میں بالعموم تمدن۔ معاشرت۔ کلچر ایک طرف اور رنگ۔ نسل۔ زبان۔ ملک وغیرہ کے اشتراک کو دوسری طرف قومیت کا اساس سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن ان عناصر اور ان کے اشتراک کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس وحدت تخیل اس اشتراک ذہنیت کا مدار صرف ایک بات پر ہے یعنی ایمان اور جو ذہنیت و تخیل اس وحدت کے خلاف ہے اسے وہ کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ بدقسمتی سے غیر مسلم طبقہ میں کفر یا کافر کے لفظ سے بڑے مکروہ معنی لئے جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس لفظ کا اطلاق نفرت و حقارت کے جذبات اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ ہر وہ شخص جو اس خاص قسم کا تخیل اپنے دل میں رکھے جو قرآن نے قائم کیا ہے وہ مومن کہلائیگا۔ اور جو شخص اس تخیل سے جداگانہ تخیل رکھے وہ غیر مومن یعنی کافر کے نام سے منسوب ہوگا۔ لہٰذا قرآن کریم کے اصول کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں ہو سکتی ہیں۔ مومن اور کافر چنانچہ ایسے دو انسان جن کا رنگ۔ نسل۔ زبان۔ ملک۔ معاشرت ایک دوسرے سے بالکل مختلف و

ومتبائن ہوں۔ اس وحدتِ تخیل کی بنا پر جسے ایمان کہا گیا ہے۔ ایک ہی قوم کے فرد کہلائیں گے اور اس کے برعکس ایسے دو انسان جو دوسری قسم کا تخیل رکھتے ہوں۔ اس قوم سے جداگانہ دوسری قوم سے متعلق ہو جائیں گے۔ خواہ ان کا رنگ۔ زبان۔ ملک وغیرہ پہلے دو انسانوں سے مشترک ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں قوم کا لفظ انہی معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ قوم الظالمین سے مراد نوع انسانی کے تمام وہ افراد ہیں جن کی ذہنیت میں ظلم کا تخیل مشترک ہے۔ خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی حصے کے رہنے والے ہوں۔ قوم الفاسقین میں تمام وہ فاسق شامل ہیں جو تخیل فسق میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔ خواہ ایک فریقہ کے صحرا کا باشندہ ہے اور دوسرا قطب شمالی کا۔ قوم نوحؑ۔ قوم لوطؑ وغیرہ سے بھی وہی لوگ مراد ہیں۔ جو ان حضرات میں انبیاء کرام کے متعلق ایک مخصوص ذہنیت رکھنے میں مشترک تھے۔ سارے قرآن کریم میں دیکھئے کہیں دو مختلف تخیل رکھنے والے افراد کو ایک قوم کے افراد نہیں کہا گیا۔ وحدتِ تخیل کی بنا، زبان، رنگ۔ نسل۔ ملک۔ معاشرت وغیرہ میں سے کسی کے اشتراک پر نہیں۔

دنیا میں آبادی کی تقسیم جس لحاظ سے ہوئی ہے اس سے یہ تو ضروری نہیں کہ کسی ایک ملک میں ایسے ہی افراد آباد ہوں جنکا اس وحدتِ تخیل میں اشتراک ہو۔ متضاد تخیل کے انسان ایک جگہ آباد ہو گئے لیکن ایک مقام پر رہنے کی وجہ سے ان میں باہمی تعاون و اشتراکِ عمل کی ضرورت ہوگی۔ اور اس تعاون اور اشتراکِ عمل کے لئے ان میں باہمی اتحاد بھی ضروری ہوگا۔ آج اس کی سب سے بین مثال خود ہندوستان ہے جس میں دو ایسی بڑی بڑی جماعتیں موجود ہیں جن کا تخیل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن بایں ہمہ ان کا معاونت اور اشتراکِ عمل سے کام لینا ناگزیر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دو قوموں میں باہمی اتحاد کس نوعیت اور کس شکل کا ہو سکتا ہے۔ دنیا کی اور قومیں تو ان مسائل کو سیاسی اور معاشرتی نظریوں سے حل کریں گی۔ لیکن مسلمانوں کے لئے تو ان تمام مباحث کے حل کا معیار صرف ایک ہے اور وہ قرآن کریم۔ کتاب مبین ہے جو ایک مسلمان کے ہر شعبۂ حیات میں مشعلِ ہدایت اور خضرِ راہ ہے۔ وہ پہلو اقتصادی ہو یا معاشرتی سیاسی ہو یا معاشی۔ اخلاقی ہو یا عمرانی۔ بہر حال قرآن کریم کا حکم آخری حکم اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

"کسی مومن مرد و عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں (یا حکم دیدیں) تو اُن کو اپنے امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کا کہا نہ مانیگا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔" (۳۳ : ۳۶)

موجودہ سیاسی کشمکش میں مسلمانانِ ہندوستان میں دو بڑی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا مسلک یہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کے حصول کے لئے جو ہندو اور مسلمان کا مشترکہ نصب العین ہے اور جس کے ساتھ ان دونوں کے مفاد مشترکہ طور پر وابستہ ہیں۔ غیر مسلم قوم یعنی ہندوؤں کے ساتھ بلا کسی شرائط و قیود کے قلبی اتحاد پیدا کر لینا چاہیئے۔ سیاسی مسلک میں ان پر کلیتہً اعتماد ہو۔ اس کے لئے کسی قسم کے میثاق و وفاق کی ضرورت نہیں حقوق کا تحفظ۔ یا ماحصل سے انتفاع کا تناسب۔ یہ سب مسائل بعد کے ہیں جو حصولِ مقصد پر خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس جماعت کو عام طور پر قوم پرست یا نیشنلسٹ کہا جاتا ہے۔ دوسری جماعت ایسی ہے جس کا مسلک یہ ہے کہ چونکہ ہمارے اور ہندوؤں کے عناصر تخیلی بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے ہم اور وہ۔ محض ایک ملک میں بسنے کی بنا پر۔ ایک قوم نہیں ہو سکتے جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ہر چند ہمارا اور ان کا اشتراک عمل ضروری ہے لیکن۔ ہمیں اس بات کا کامل اطمینان کر لینا چاہیئے کہ حصولِ مقاصد کے بعد ہمارے حقوق اور عناصر تخیلی کا تحفظ ٹھیک ٹھیک ہو گا۔ اس اطمینان کے لئے کسی معاہدہ۔ کسی میثاق کی از بس ضرورت ہے۔ اور وہ معاہدہ یا میثاق ایسے کھلے کھلے اور واضح الفاظ میں ہونا چاہیئے کہ جس سے اس بات کی ضمانت ہو جائے کہ ہمارے وہ عناصر تخیل جن کے مستقل خطوط پر ہماری قوم کی عمارت کھڑی ہے۔ فاطبتہً محفوظ ہو گئے۔ لہٰذا وہ دلی بھروسے اور قلبی اعتماد کی بجائے کہ جن پر اتحاد کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے ایک ایسا سمجھوتا چاہتے ہیں جو دلی اطمینان پیدا کر دے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ہمسایہ قوم سے ہمارا اتحاد نہیں بلکہ وفاق ہونا چاہیئے۔ چونکہ یہ دونوں گروہ مسلمانوں ہی کے ہیں اسلئے دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اس قسم کے اتحاد کے لئے جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہے یا ہی

قلبی تولّی اور دوستداری کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے دوست کے لئے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ جو وقت پر کارساز بن سکے۔ قرآن کریم نے ولی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اللہ ولی الذین اٰمنو یخرجھم من الظلمت الی النور والذین کفروا اولیٰئھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمت۔ اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔ (۲۵۷-۲)	اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے۔ ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے دوستدار طاغوت ہیں۔ وہ انہیں نور سے نکال کر ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن کریم نے ذہن انسانی میں خدا کے متعلق جو ایقان پیدا کرنا چاہا ہے وہ سب سے مقدم بھی ہے کہ بھروسہ اور اعتماد کے قابل صرف اس کی ذات ہے۔ اس ذات کے خلاف جس قدر دنیاوی قوتیں ہیں وہ انہیں طاغوتی قوتیں قرار دیتا ہے۔ باقی رہا یہ عالم اسباب۔ سو اس میں اعتماد اور بھروسہ کے قابل بھی اس کو سمجھا جائیگا جسکو ایسا سمجھنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بار بار اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ تمہارے ولی (دوست) صرف مسلمان ہو سکتے ہیں۔ یعنی اس قلبی اعتماد و تولّی کے لئے اس وحدتِ تخیل کا ہونا ضروری ہے۔ جسے ایمان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ برائی سے روکتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ ضرور رحمت کریگا۔ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔" (۹ : ۷۱)

دوسری جگہ ہے

"تمہارے دوست تو اللہ اور اس کا رسول اور وہ ایماندار لوگ ہیں۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے" (۵ : ۵۵)

دیکھئے وہی وحدتِ تخیل کا تصور سب سے پہلے نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد وحدتِ عمل جسے عبادات کہتے ہیں یعنی قلبی تولّی کے لئے۔ اتحاد اور یگانگت کے لئے۔ کہ اتحاد کے معنی ہی ایک ہو جانا ہے

وحدت تخیل یعنی ایمان اور وحدت عمل یعنی اسلامی منہاج کے مطابق اعمال ضروری قرار دئے گئے ہیں۔

دنیا میں دیگر اقوام اپنے معاملات میں اقتصادی۔ سیاسی۔ معاشی اور معاشرتی نقطۂ نظر کو ہمیشہ مقدم سمجھتی ہیں۔ اور انہیں امور کی مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھ کر دوسری اقوام سے اشتراکِ عمل کا فیصلہ کرتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک ان تمام امور سے مقدم ان کا دینی تخیل ہے اور اس تخیل کے مطابق تمام مصالح و مفاد کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اب یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری قوم سے ان کے اقتصادی۔ سیاسی وغیرہ مفاد مشترک ہو جائیں اور مشترکہ سعی و عمل سے حصولِ مقاصد کے بعد ان دونوں قوموں کے اقتصادی و سیاسی حالات میں فروغ ہو جائے۔ لیکن کیا یہ بھی کبھی ممکن ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس کو پسند کرے۔ کہ مسلمانوں کی "اسلامی حالت" کو فروغ ہو جائے۔ اور مسلمان بحیثیت مسلمان دنیا میں ترقی کر جائیں۔ تاریخ اس کی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ اس لئے کہ فطرتِ انسانی کے خالق نے اسکے متعلق واضح طور پر فرما دیا کہ۔

"اے ایمان والو۔ اپنے سوا کسی اور کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی سر نہیں اٹھا رکھینگے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنا رکھتے ہیں بعض (منصوبے) تو ان کے منہ سے ظاہر ہو پڑتے ہیں۔ اور جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم عقل والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت رکھتے ہو۔ مگر وہ کبھی تم سے محبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی صاحبِ ایمان ہیں۔ اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ جاؤ اپنے غصے میں مر مٹو۔ اللہ دلوں کے حالات سے واقف ہے۔ اگر تمہیں کوئی اچھی بات پہنچ جائے تو ان کے لئے موجبِ غم ہوتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم استقلال و تقویٰ سے رہو تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکینگی اللہ ان کے اعمال پر محیط ہے۔" (۳: ۱۱۷-۱۱۹)

ان حقائق قرآنی کو سامنے رکھئے اور غور سے دیکھئے کہ کیا ہندوستان میں آپکو اس کی مثالیں نہیں ملتیں کہ مسلمانوں کی ملی و مذہبی خصوصیات کو مٹانے کے لئے کیا کیا منصوبے اندر ہی اندر پیش ہوتی رہتی ہیں جن دنوں ابھی باہمی حجاب تھا۔ یہ علانیہ باہر کم آتی تھیں لیکن جوں جوں وہ پردے اٹھتے چلے گئے ایک ایک بات ان کے منہ سے باہر آگئی۔ اور ابھی پتہ نہیں کہ دلوں میں کیا ہے۔ مسلمان کو تو اس کے قرآن نے مجبور کر رکھا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام کرے۔ کوئی قوم اپنے کسی مقدس پیشوا کو مذہبی پیشوا کی حیثیت سے پیش کرے۔ مسلمان پر لازم آجاتا ہے کہ اس کی شان میں سوءادبی نہ کرے کہ شاید وہ ان انبیاء میں سے ہی ہو جن کا ذکر قرآن نے نہیں کیا۔ لیکن جن پر مجملاً ایمان لانا از روئے قرآن لازمی ہے لیکن کیا کسی اور قوم نے بھی مسلمانوں کے متعلق اس قسم کی رعایت پیش نظر رکھی ہے؟ کیا کسی نے ایسا کیا ہے کہ ان کے پیغمبر کی تعظیم کو اپنے ہاں جزوِ ایمان بنالے۔ اسکو چھوڑیئے کیا زبان کے مسئلہ کو محض اس لئے نہیں اہمیت دی جا رہی کہ اردو زبان کی وساطت سے مسلمان اپنے کلچر کے کسی ایک حصہ سے متمسک ہیں اور ذرا آگے چلئے جن دنوں شدھی کا زور تھا۔ مسلمان ملکانوں کو ہندو بنانے کے لئے سنگھٹن ہو رہا تھا ان دنوں مذہب کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ مذہب آزادیٔ ضمیر کا نام ہے جس مذہب پر کسی کے دل کو اطمینان ملے وہی اختیار کرنا چاہیئے۔ حالانکہ انہی کے ہاں کے مذہبی لوگ یہ پکار پکار کر کہتے تھے کہ جو مسلمان ہندو بنایا جا رہا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں کسی قرآن میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس کے برعکس آج اگر ہندوستان کے اچھوت محض اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ہندو دھرم کو چھوڑ کر کوئی ایسا دین اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کو انسانی مساوات مل جائے تو ہر "آزادی کے خواہاں" "سوراج کے طالب" ہندو کے دماغ میں خطرہ کی گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے۔ اور ہندوستان کی مشترکہ آزادی کے حصول کی تحریک کے قائدِ اعظم کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ:۔

"مذہب کوئی چولہ یا مکان نہیں کہ جب جی چاہا تبدیل کر لیا۔ اس کا تعلق جنم سے پیشتر اور جنم کے بعد تک ہے" جب دلوں کی یہ حالت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے قلبی یگانگت کس طرح ممکن ہو سکتی ہے اور ان سے بلا شرائط و قیود اتحاد کس اعتماد اور بھروسہ کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ وہ اپنے مخصوص عناصرِ تخیّل کی بنا پر اپنے آپ کو ایک الگ قوم سمجھتے ہیں۔ اور ایسا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

اور جب وحدتِ تخیل کا یہ اختلاف ہو تو وہاں مسلمان کے لئے تولّی و تودد کس طرح جائز ہو سکتا ہے عناصر تخیل کا اختلاف تو وہ بنیادی اختلاف ہے کہ دوسرے تو ایک طرف جو خود اپنے عزیز رشتہ دار ہیں ان سے بھی اس قسم کے تولّی سے منع کیا گیا ہے۔

"جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہوں۔ گو وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔ اور ان کو اپنی روح کے ساتھ قوت دی ہے۔ ان کو وہ ایسے باغات میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہینگے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یہ اللہ کا گروہ ہے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہے۔" (۵۸:۲۲)

اسلام ملت ابراہیمی کا نام ہے۔ قرآن کریم میں صرف دو ہستیوں کے نقوش قدم کو اہل ایمان کیلئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ ملت موحدہ کے مورث اعلےٰ جناب حضرت ابراہیم اور خاتم الانبیاء حضرت محمد الرسول اللہ جہاں اسوۂ ابراہیمی کا ذکر فرمایا ان کی خصوصیت میں یہی بات بتائی کہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک دوسری قوم وحدتِ تخیل میں ان کے ساتھ شریک نہ ہو ان میں کبھی قلبی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ غور فرمائیے کس قدر بلند و بلیغ الفاظ میں قرآن کریم نے اس کا ذکر فرمایا ہے:-

"اے ایمان والو۔ تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ۔ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو حق کے ساتھ آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں . . . . اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو فوراً تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئیں گے . . . . تمہارے لئے ابراہیم۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان میں ایک عمدہ نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہدیا۔ کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارے منکر ہیں۔ اور ہم میں

اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض ظاہر ہے جب تک کہ تم اللہ واحد
پر ایمان نہ لاؤ .... (۶۰ : ۴)

چنانچہ اسلام سے پیشتر عرب میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا حلیف ہوتا تھا - ایک خاندان دوسرے خاندان کا دوست ہوتا تھا - لیکن اسلام کے بعد قبائل کی اضافت اور خاندانوں کا اتحاد سب منقطع ہو گیا - اور اتحاد و اختلاف کا ایک اور صرف ایک معیار باقی رہ گیا - مسلم و غیر مسلم - ایک ہی نسل - ایک ہی رنگ ایک ہی زبان - ایک ہی وطن کے لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے - اور یہی دو گروہ دو الگ الگ قومیں بن گئیں - ایک حزب اللہ اور ایک حزب الشیطان - (۱۳-۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جس تحریک حزب اللہ کی طرح ڈالی تھی وہ بھی انہیں خطوط پر قائم تھی) البتہ وہ لوگ جو بظاہر مسلمان ہونے کا دعوے کرتے تھے لیکن دل میں ان سے اختلاف تھا - ان لوگوں کی حالت ضرور تھی کہ وہ دوسری قوم سے اس قسم کا قلبی اتحاد رکھتے تھے - چنانچہ قرآن کریم میں ان کے متعلق ہے -

"منافقین کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے بڑی دردناک سزا ہے - جن لوگوں کی یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست بناتے ہیں - کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں - سو عزت تو سب اللہ کے پاس ہے -"

(۴ : ۱۳۸)

ایک بات تو بالکل واضح ہے - مسلمان اگر غیر مسلم اقوام سے اس قسم کا اتحاد کریں گے تو ظاہر ہے کہ اپنی کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے کریں گے - یعنی دوسروں کی قوت کے سہرے میں پناہ لینے کی کوشش کریں گے - اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو دنیا میں اپنا پشت و پناہ تصور کیا جائے اس کی جائز و ناجائز ہر قسم کی تقلید ضروری ہو جاتی ہے - پندرہ بیس سال ادھر کے حالات سامنے رکھئے - کیا ہمیشہ یہی نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی جمعیتوں اور کانفرنسوں کے اجلاس کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ منعقد ہوتے رہے ہیں - صبح کانگریس نے جو ریزولیوشن پاس کیا - اور شام کو وہی ریزولیوشن ہز ماسٹرز وائس کی طرح مسلم پنڈال کے گراموفون سے الاپا گیا - کہہ دیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کے ریزولیوشن ہوتے ہی ایسے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ملی و مذہبی مفاد کے خلاف نہیں تھے - سو اول تو یہی امر محل نظر ہے لیکن اگر اسے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کر لیا جائے تو اتنا ضرور

ماننا پڑیگا کہ مسلمان جو دنیا میں دیگر نوع انسانی کی قیادت کے لئے آئے تھے۔جنہیں خیر امت کہا گیا تھا۔ جن کی دعائیں متقین کا پیشوا بننے کی تھیں۔جن کے موسس اعلیٰ کو اماماللناس کہا گیا تھا۔ان کی ذہنیت میں اس قدر پستی آگئی کہ وہ ہر معاملہ میں غیر مسلم دماغوں کی تقلید کے خوگر ہو گئے۔ان میں کوئی ایسا دماغ باقی نہ رہا کہ وہ اپنے معاملات میں سبقت کرتے اور کانگریس ان کی اتباع کرتی۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کے قوائے ذہنیہ یوں مفلوج ہو کر رہ جائیں۔ وہ اپنی خودداری اور خود اعتمادی سے یوں عاری ہو جائے ان میں اندھی غلامی کے سوا اور کیا باقی رہ سکتا ہے۔اور رفتہ رفتہ ان کی اپنی ذہنیت خالصتاً قوم غالب کی ذہنیت میں مدغم ہو جاتی ہے۔اور قوم غالب کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی ہے۔اس حقیقت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"وہ لوگ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود کافر ہیں اسی طرح تم کو بھی کافر بنا دیں تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ۔پس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا ۔۔۔"۔ (۴: ۸۹)

کیا کانگریس کا نصب العین یہی نہیں کہ ہندوستان کے باشندے ایک قوم ہو جائیں۔اور کیا یہ برابری۔ یہ ادغام وہی نہیں جسکا ذکر آیت بالا میں پڑا ہے؟ کیا بار ہا بار یہ الفاظ ہندوستان کی فضا میں نہیں گونجے کہ مسلمان ہندوستان میں یا تو ہندوؤں جیسے بن کر رہیں۔یا ترکِ وطن کر جائیں کہ یہ وطن ہندؤں کا ہے کہدیا جائیگا کہ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی ذہنیت رکھتے ہیں۔لیکن کیا آج تک کسی ہندو لیڈر نے ان "چند ایک" ذہنیتوں کی تردید میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ہے؟ کیا کانگریس نے کبھی ان لوگوں کا بائیکاٹ کیا ہے؟ اگر کسی نے کسی وقت کسی مصلحت کی بنا پر ایسا کیا بھی ہے تو دیکھا نہیں گیا کہ قوم نے اسکو کس طرح آڑے ہاتھوں لیا ہے؟ نہیں! کیا ان میں سے وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ایک قوم ہو جانے کے مدعی ہیں۔ان کی تمام مساعی۔ ان کی تمام کاوشیں۔انہیں میں صرف نہیں ہو رہیں کہ ہندو کہلانے والی قوم کے ہر اعتبار سے اکثریت ہو۔ اگر ایک قوم بن جانا ہی مقصود ہے تو اس میں کیا خطرہ ہے کہ اس قومِ واحد میں اکثریت غیر ہندوؤں کے ہو جائے۔لیکن اس بات کو ان میں سے ایک قوم پرست بھی گوارا کرتا ہے؟ جب حالت یہ ہے تو پھر کبھی کیوں نہ سمجھا جائے جو قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ بعض باتیں ان کے منہ سے نکل پڑتی ہیں۔اور ان کے دل میں جو ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

قرآن کریم کبھی مسلمانوں کو ایسا سبق نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کے آسرے پر زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ آپ کے نزدیک ایسی زندگی یکسر غیر اسلامی زندگی ہے۔ اور یہی وہ تعلیم ہے جسے وہ مختلف پہلوؤں سے بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

لا یتخذ المومنون الکافرین اولیآء من دون المومنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیئ الا ان تتقوا منھم تقٰۃ۔ ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر۔ (۳-۲۷)	مسلمانوں کو ہرگز نہیں چاہیئے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست (ولی) بنائیں۔ اور جو کوئی ایسا کریگا وہ اللہ سے دوستی رکھنے میں کسی شمار میں نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ کہ تم اپنے آپ کو ان سے کما حقہ محفوظ رکھو۔ اور اللہ تم کو صرف اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

بعض حضرات اس آیت سے ایک عجیب و غریب مفہوم لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں "مگر جب تمکو ان سے ڈر ہو تو البتہ ان سے دوستی رکھو" لیکن جو شخص قرآن کریم کی اصولی تعلیم اور روح سے واقف ہے وہ کبھی یہ معنی نہیں لے سکتا۔ قرآن تو دنیا میں دینِ حنیف کا پیغامبر ہے۔ وہ ہر بات میں کھلے کھلے راستے کی تلقین کرتا ہے۔ اگر وہ مومن ہے تو وہ کھلا کھلا مومن۔ اگر کافر ہے تو کھلا کھلا کافر۔ اس کے بین بین راستے کو وہ منافقین کا راستہ بتاتا ہے۔ وہ کبھی اس مسلک کی اجازت نہیں دے سکتا کہ جب تم کسی سے ڈرو تو بظاہر اس کی دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ اور دلمیں اس سے بغض رکھو۔ وہ اس قسم کی ذہنیت کو بدترین ذہنیت۔ اور اس قسم کی روش کو بدترین روش قرار دیتا ہے۔ مسلمان جس کے حلیف ہونگے کھلے کھلے حلیف۔ جس کے حریف کھلے کھلے حریف۔ پھر اس آیت کا یہ ٹکڑا کہ خدا تم کو صرف اپنی ذات سے ڈرنے کا حکم دیتا ہے انصاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دوسروں سے ڈرنے کی یہاں گنجائش ہی نہیں۔ واتقوا کا مادہ وقی ہے جس کے لغوی معنی ہیں اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا جس سے خوف ہو۔ ڈرنا یا خوف کھانا محض مرادی ہیں۔ (دیکھو مفردات امام راغب)۔ لہذا آیت کے اس ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "تم سے اپنے آپ کو بچائے رکھو جو حق بچائے رکھنے کا ہے"۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اگر کسی صاحب کو اس معنی سے اختلاف ہو تو تفصیلاً اس کو ثابت کر دیا جائیگا۔ یوں بھی آپ دیکھیں تو اس قسم کی تعلیم سے فائدہ

کیا ہے۔ جب دوسری قوموں کو یہ پتہ لگ جائے کہ مسلمان ان سے اس لئے دوستی رکھتے ہیں کہ وہ ان سے ڈرتے ہیں۔ تو اوّل تو وہ اس قسم کی دوستی کو کچھ وقعت ہی نہ دیں گے۔ جو دل سے نہ ہو۔ ظاہرداری سے ہو۔ اور اگر ان کو اس کی ضرورت ہوگی تو وہ ہمیشہ یہی کوشش کریں گے۔ کہ ان کا خوف کبھی مسلمانوں کے دل سے دور ہی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اتحاد کیا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ عنوانات ظاہر کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے وہ قائدین جو کبھی اسلام اور اسلامیات کے تحفظ میں بپھرے ہوئے شیروں کی طرح گرجتے تھے۔ آج اپنی ذہنیت کو ہی بدل چکے ہیں۔ اور بڑی ندامت سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ دوستی انہوں نے بہت بڑی قیمت کے عوض خریدی ہے۔

یہ تو تھی اس اتحاد کی صورت جس کی بناء کامل اعتماد اور بھروسہ قلبی موخات اور دلی توثّق پر رکھی جاتی ہے۔ اور جس کی استواری کے لئے خود خدا اور اس کا رسول ہیں المسلمین سب سے بڑی ضمانت ہیں۔ لیکن ان قوموں کے ساتھ جو وحدت تخیل میں ان سے مختلف ہوں۔ معاہدہ و میثاق کی رو سے باہمی تعاون و توافق ہو سکتا ہے۔ اور ہونا چاہئے بھی۔ اسلام دنیا میں امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ وہ نوع انسانی کے ساتھ۔ بلا تمیز مذہب و ملت۔ بہترین سلوک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہمسایوں کے حقوق کے خاص طور پر تاکید کرتا ہے۔

"اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اور قرابت داروں کے ساتھ۔ اور یتامیٰ و مساکین کے ساتھ اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ۔ اور دور والے پڑوسی کے ساتھ۔ اور ہم مجلس کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور ملک یمین کے ساتھ۔ بیشک اللہ ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو تکبر کرتا ہو اور شیخی مارتا ہو۔" (۴ : ۳۶)

اور دیگر اقوام سے خوش اسلوبی کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس لئے ہمسایہ اقوام سے باہمی معاہدات کی رو سے اشتراک عمل پیدا کرنا۔ نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں ان سے تعاون کرنا۔ قرآن کی رو سے ضروری ہے۔ چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ان لوگوں کی حفاظت و صیانت سے برأت کا اعلان کیا گیا ہے جو اپنی سرکشی

وعدوان سے امن عامہ کو کبھی قائم ہی نہیں رہنے دیتے تھے۔ وہاں صاف صاف الفاظ میں ان مشرکین کی استثنار کی گئی ہے جن سے مسلمانوں کے معاہدات تھے۔

"۔۔۔۔ اوران کفار کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ ہاں مگر وہ مشرکین کہ جنہوں نے عہد باندھا اور پھر اس میں کوئی کمی نہ کی۔ اور تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد نہ کی۔ سو ان کے معاہدات کو ان کی مدتِ معینہ تک پورا کرو۔۔۔۔" (۹ : ۴)

یہی نہیں بلکہ دوسری جگہ جہاں ان منافقین سے جو بظاہر مسلمانوں سے وحدتِ تخیل کے مدعی تھے لیکن دل میں دوسری قوم سے تولّی رکھتے تھے جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ وہاں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس قوم کے پاس جا کر پناہ لے لیں جن کے ساتھ تمہارے معاہدات ہیں تو پھر ان پر جارحانہ کارروائی نہ کرو (۴:۹۰) اسلام نے عہد کی پابندی کو بڑی اہمیت دی ہے (۵ : ۱) ۔ حالانکہ اس کے برعکس یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ قوم مخالف ان عہود و میثاق کی چنداں پرواہ نہیں کریں گے۔

یہ لوگ کسی مسلمان کے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں گے۔ نہ قول واقرار کا۔ یہ لوگ حد سے گذرنے والے ہیں۔ (۹ : ۱۰)

غیر اقوام کو تو مسلمانوں سے کبھی گھبرانا ہی نہیں چاہیئے وہ تو اپنے خدائی احکام سے اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ کسی پر زیادتی کر ہی نہیں سکتے۔ عہد و پیمان کے ایفا کی تاکید آپ دیکھ چکے ہیں اب ان قوموں کے بارے میں قرآنی حکم ملاحظہ فرمایئے جن سے عہد و پیمان تو نہیں۔ لیکن انہوں نے ان کی مخالفت کبھی نہیں کی۔

امید ہے کہ اللہ ان لوگوں میں جو تم سے عداوت رکھتے ہیں اور تم میں مودّت پیدا کر دے۔ اور اللہ کو بڑی قدرت ہے۔ اور اللہ غفور الرحیم ہے۔ اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف سے نہیں روکتا۔ جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ دوستی (تولّی) سے روکتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑتے ہوں۔ اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو یا تمہارے نکالے جانے کی مدد کی ہو۔ اور جو ایسوں سے تولّی کرے گا۔ وہ ظالمین

میں سے ہوگا۔" (۹-۷ : ۶۰)

دیکھئے جن لوگوں سے احسان اور انصاف کی تاکید کی گئی ہے۔ ان سے صرف تودّد کی اجازت دی گئی ہے۔ نہ کہ تولّی کی۔ اور جو لوگ مخالفت پر آمادہ ہوں اور وہ بھی دین کے معاملہ میں۔ اور مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کی فکر میں ہوں۔ ان سے کسی صورت میں تولّی کی اجازت نہیں۔ لیکن احسان۔ انصاف اور تودّد ایسی چیزیں ہیں کہ دوسری اقوام تو کبھی اس قسم کی تعلیم کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتیں۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ وہ قومیں جو مسلمانوں کی کھلی کھلی دشمن ہوں۔ ان کے بارے میں قرآن کا کیا حکم ہے۔ فرمایا:

لا یجرمنکم شنآن قوم ان لا تعدلوا اعدلوا۔	کسی قوم کی دشمنی تمہیں کہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ ان سے عدل نہ کرو۔

جس قوم کی مذہبی تعلیم یہ ہو اس قوم سے دوسری اقوام کو کیا خطرہ۔ یہ کبھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ کبھی بے انصافی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہماری ہمسایہ اقوام کو اس بات سے خوف نہیں کھانا چاہئے کہ قرآن کریم مسلمانوں کو ان سے تولّی کی اجازت نہیں دیتا۔ تولّی ایک ایسا تعلق ہے جو انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتا ہے جن میں وحدتِ تخیل قدر مشترک ہو۔ لیکن تولّی کو چھوڑ کر۔ معاہدہ و میثاق کی رو سے جس قسم کے اتحاد۔ اور عام طور پر جس قسم کے احسان و انصاف کی تعلیم قرآن پیش کرتا ہے۔ وہ کیا اس بات کے لئے کم ضمانت ہے۔ کہ مسلمان کبھی کسی پر ظلم نہیں کر سکتے۔ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس سے زیادہ کسی دوسری قوم سے توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔

تصریحات بالا کو پیش نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ جو مسلمان قوم پرست ہندوؤں سے بلا شرائط و عہود پورے پورے بھروسہ و اعتماد کی دوستی کے مدعی ہیں۔ ان سے تولّی کے دعویدار ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ان کا یہ طرزِ عمل کیسا ہے۔ دو باتیں کھلی کھلی ہیں۔ اگر ان کا یہ طرزِ عمل۔ ان کی یہ دوستی۔ دلی اور مخلصانہ ہے تو قرآن کسی صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر وہ کسی مصلحت کے ماتحت محض ظاہر داری سے ایسی روش اختیار کئے ہوئے ہیں تو ہر چند اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اس بارے میں ہندوؤں سے یہ سوال ہے کہ وہ اس قسم کی دوستی پر اعتماد کیسے کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی صورت

محض وفاق و میثاق کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ کھلی کھلی شرائط کی رو سے ہو سکتی ہے۔ جنکی رو سے مسلمانوں کو اپنے عناصرِ تخیل کے تحفظ کا پورا پورا یقین ہو جائے۔ پھر اس کے بعد ہندو۔ یا کوئی دوسری قوم جو ایسا معاہدہ کرے خود بخود دیکھ سکتی ہے کہ مسلمانوں کا طرزِ عمل کیسا ہوتا ہے۔ وہ اشتراکِ عمل میں کتنی بڑھ کر قربانی کرتے ہیں۔ لیکن یہاں تو بساطِ سیاست میں ایک ایسی گہری چال چلی گئی ہے۔ جو کبھی صحیح شکل میں ایک دوسرے کے دلوں کو دیکھنے ہی نہیں دیتی۔ قوم غالب عام طور پر اس میں اپنا مفاد سمجھتی ہے کہ وہ بلا شرائط طے کئے اقلیت کو شریکِ عمل بنا لے۔ مقصد ان کی قربانیوں سے حاصل کرے اور ماحصل مساعی کی تقسیم اپنے ہاتھ میں ہو۔ لہٰذا اس غرض کے حصول کے لئے انہوں نے فائدہ اس میں دیکھا کہ مسلمانوں میں سے "قوم پرست" کہا ہی اسے جائے جو بلا کسی قیود و حدود کے۔ بلا کسی عہد و معاہدہ کے ان کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اور جو ایسی باتیں کہے جس پر حقیقی اتحاد کی بنیادیں قائم ہو سکیں۔ جو دونوں قوموں کے دلوں سے ایک مستقل عدمِ اعتمادی کو دور کر سکے۔ یعنی جو اشتراکِ عمل سے پیشتر ان سے شرائط کا طالب ہو۔ تو اس کے پیچھے گلی محلے کے لونڈے لگا دئے جائیں۔ اور اسے "فرقہ پرست" کے نام سے مشہور کر دیا جائے۔ میدان سیاست کی تدابیر بڑی دور رس ہوتی ہیں۔ "فرقہ پرست" کا لفظ یہاں ایسے معنوں میں استعمال کرایا گیا ہے کہ جس سے خواہ مخواہ نفرت پیدا ہو۔ حالانکہ فرقہ پرستی کوئی معیوب بات نہیں۔ سب سے بڑا فرقہ پرست تو خود سب سے بڑا کانگریسی ہے۔ اس کا فرقہ چونکہ اکثریت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے اس نے قوم کا لفظ رائج کر لیا ہے۔ اور اپنے آپ کو قوم پرست کہتا ہے۔ برعکس اس کے مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی قوم کے لئے فرقہ کا لفظ رائج کر رکھا ہے۔ اور ان کے قوم پرستوں کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے۔ باقی رہا مسلمان قوم پرستوں کا یہ سوال کہ ہم یہاں اقلیت میں ہیں۔ اکیلے ہیں کمزور ہیں اس لئے ہمیں قوم غالب کی دوستی کی ضرورت ہے۔ تو اس کے لئے بھی قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ موجود ہے۔

"اور اگر تمہیں مفلسی کا ڈر ہو تو اللہ چاہیگا تو تمہیں اپنے فضل سے محتاج نہ رکھیگا۔" (۹:۲۸)

دوسری جگہ ہے:۔

"اصل مومن وہ ہیں کہ جن سے جب لوگوں نے کہا کہ تمہارے لئے مخالفین نے بڑے بڑے سامان جمع کر رکھے ہیں سو تمہیں ان سے ڈرنا چاہیئے تو اس بات نے ان کے ایمان کو اور

زیادہ کر دیا اور انہوں نے کہدیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے ۔ اور وہی بہترین کارساز ہے ۔ پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے دامن بھر کر واپس لوٹے اور ان کو کوئی ناگواری پیش نہ آئی اور وہ لوگ رضائے حق کے تابع رہے ۔ اللہ بڑے فضل والا ہے ۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں کہ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈرتا ہے ۔ سو تم ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ہی ڈرنا ۔ اگر تم ایمان والے ہو تو ۔" (۳ : ۱۷۴۔۱۷۳)

امید ہے کہ مسلمان قوم پرست " ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور سوچینگے کہ قرآن کریم کی رو سے دیگر اقوام کے ساتھ کس قسم کی دوستی جائز ہے ۔ اور ہندوؤں سے مسلمانوں کا اتحاد کس صورت میں ممکن ہے ۔

میں تلاش میں تھا کہ مسلمان نیشنلسٹ جماعت میں سے وہ حضرات جو علوم دین سے واقف ہیں ان کے وہ دلائل معلوم ہو سکیں جن پر ان کی قوم پرستی کا مدار ہے ۔ تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ قرآن کریم کی کونسی تعلیم کو وہ اپنے طرز عمل کا مؤید قرار دیتے ہیں ۔ لیکن افسوس کہ آج تک کہیں سے ایسی چیز نہ مل سکی ۔ مولینا آزاد نے ایک رسالہ " اسلام اور نیشنلزم " کے نام سے لکھا ہے میں نے بڑے شوق سے منگایا ۔ شروع سے اخیر تک دیکھ گیا اور نہ سمجھ سکا کہ متن کتاب کو عنوان سے نسبت کیا ہے ۔ میرے تصور کے برعکس انہوں نے تو شروع سے اخیر تک وطنیت اور قومیت کی مخالفت کی ہے ۔ اور وہ اسلام کے اس عالمگیر ۔ حدود فراموش ۔ برادری کو ہی اصل قومیت قرار دیتے ہیں جس کی بناء رنگ ۔ نسل ۔ زبان ۔ وطن کے اشتراک پر نہیں بلکہ بلکہ وحدت تخیل یعنی ایمان کے اشتراک پر ہے ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :۔

"قومیت اور وطنیت انسان کے اجتماعی رشتہ کے ایک خاص حالت کا نام ہے لیکن یہ کوئی مستقل حالت نہیں ایک سلسلہ دراز کی مختلف کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے ۔" (۲۰)

پھر ارشاد ہے :۔

"لیکن اسلام ان منزلوں میں نہ رک سکا ۔ اس نے ان تمام رشتوں اور رشتوں کی بنیادوں سے انکار کر دیا ۔ جو انسان کے علم و نظر نے بنا رکھے تھے ۔ وہ نسل ۔ وطن ۔ جنس ۔ رنگ

زبان کسی غیر حقیقی رشتے کو تسلیم نہ کر سکا۔ اور اس نے انسان کو صرف ایک ہی رشتے کی دعوت دی۔ انسانیت اور انسانی برادری کے فطری رشتہ کی۔" (ص ۲۴)

اس کے بعد انہوں نے موجودہ "قومیت" کے تصور کے مفاسد بیان کئے ہیں۔ جن کی بنا نسل۔ وطن جنس رنگ زبان پر ہے۔ اور بحث کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ

"ناگزیر ہے کہ قیام امن و اصلاح قومیت کے لئے نہ صرف ملت اسلامیہ کو بلکہ تمام دنیا کو اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق عمل پیرا ہونا پڑیگا۔" (ص ۴۸)

لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اسی تعلیم کو اس مصرع میں بیان کر دیا جائے کہ

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

تو تمام ہندوستان میں ایک خطرہ عظیم محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ یہ انتہائی فرقہ پرستی ہے۔

اس رسالہ میں مولانائے ممدوح نے ایک جگہ لکھا ہے۔" دو چیزیں ہیں۔ ایک نسل و وطن کا تحفظ ہے۔ ایک نسل و وطن کا تعصب ہے۔ اسلام کی روح تعصب کے مخالف ہے۔ تحفظ کے مخالف نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب بھی کبھی اس قسم کا دائرہ بنتا ہے تو گو اس کی ابتدا تحفظ کے جذبات سے ہوتی ہے۔ لیکن آگے چل کر تحفظ تعصب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔" (ص ۳۲)

بس یہی ہے وہ خطرہ جس کی بنا پر تحفظ دین کی ضمانت حاصل کئے بغیر تحفظ وطن کی تحریک میں اشتراک عمل مفاد ملت کے خلاف سمجھا جا رہا ہے۔ ممکن ہے مولانا کا یہ مفہوم ہو کہ جس تحفظ وطن میں ہنوز تعصب داخل نہ ہو وہی قوم پرستی ہے۔ سو عرض یہ ہے کہ وہ کون انسان ہے جو اپنے گھر کی حفاظت نہیں چاہتا لیکن فرق صرف یہ ہے کہ اگر کسی وقت تحفظ وطن اور تحفظ دین میں آویزش ہو جائے تو اسوقت ایک مسلمان کیلئے وطن پر دین کو ترجیح دینا ضروری ہوگا۔ اگر وہ دیکھے کہ وطن کی زنجیریں اس کے دین کی آزادی میں حائل ہیں۔ تو قرآن کی رو سے اس پر لازم آجائیگا کہ وہ اگر ضرورت ہو تو وطن کو ہی چھوڑ دے۔ اور یہ حقیقت تو کسی نکتہ رس دماغ سے چھپی ہوئی نہیں کہ دین سے مراد محض نماز۔ روزہ وغیرہ مناسک دین ہی نہیں بلکہ مسلمان کے دین کا تحفظ تو بڑی بڑی دستیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور دنیا بھر کی سیاست اس ایک نقطۂ ماسکہ میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ خدا معلوم حب الوطن من الایمان کے عربی جملہ کو کس نے رسول اکرم کی طرف منسوب

کرکے تمام اسلام کی سپرٹ کو غارت کردیا ۔مسلمان کا وطن تو ہر وہ خطۂ ارضی ہے جہاں کوئی بھی مسلمان آباد ہے اور اسے جغرافیائی حدود میں مقید کردینا اس عالمگیر برادری کے دائرہ کو فنا کردیتا ہے جسکی بنا، اسلام نے ڈالی ہے ۔اب ظاہر ہے کہ جس وسعت کو مسلمان وطن کہیں گے اس کے تحفظ سے ہندوؤں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ اور جس وطن کا تحفظ ہندو چاہتے ہیں اس میں جب تک مسلمان کو تحفظ دین کا یقین نہ ہو جائے اشتراک عمل ناممکن ہے ۔اور یہی وہ تحفظ ہے جسے ان دونوں قوموں کو باہمی معاہدہ کی رو سے واضح کرکے ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کرلینا چاہیئے ۔مسلمانوں کے چونکہ یہ دین کا معاملہ ہے اس لئے انہیں اس معاملہ میں صفائی سے گفتگو کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھنا چاہئے ۔اور ہندو اگر سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے تحفظ دین میں انہیں کچھ نقصان نہیں تو انہیں اس معاملہ میں واضح شرائط طے کرلینے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے ۔ باہمی افہام و تفہیم میں نہ مسلمان فرقہ پرست بن سکتا ہے اور نہ ہندو قوم فروش ۔اور اگر اس باب میں کوئی مسلمان واضح شرائط طلب نہیں کرتا تو وہ ملت کا بہی خواہ نہیں ۔اور اگر کوئی ہندو اس مطالبہ پر برا مانتا ہے تو وہ تحفظ وطن کا خواہاں نہیں ۔ہندو مسلم اتحاد اور نیشنلزم کی یہی ایک شکل ہے جسکی قرآن اجازت دیتا ہے اور بس ۔

مسئلہ تحفظِ اردو

ــــــ نعمت ہے جس سے وہ انگریزی اور اردو دونوں سے ناواقفیت کی بدولت محروم ہیں ۔

لیکن اردو کے تحفظ کی یہ تمام کوششیں بےسود ہیں جب تک ہم نستعلیق خط کے موجودہ طرز کتابت و طباعت کی بجائے "ٹائپ" کے حروف استعمال نہیں کرتے ۔ہماری رائے میں یہ اردو کی ترقی اور نشر و اشاعت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور غالباً یہی چیز کاروباری ضروریات کے لئے انگریزی زبان کے استعمال پر مجبور کرتی ہے ۔اگر ہم تھوڑے سے ایثار اور قربانی سے کام لے کر "ٹائپ" کے حروف کو رفتہ رفتہ تمام ملک میں رائج کردیں تو اس سے نہ صرف اردو کا مستقبل نہایت شاندار ہو جائیگا بلکہ اس امر کا بھی کوئی خطرہ نہیں رہیگا کہ ہم اپنے حسین اور خوشنما رسم الخط کی بجائے لاطینی کے گول مول یا ہندی کے بدنما اور بدشکل حروف اختیار کریں ۔

مسئلہ تحفظ اردو

سید نذیر نیازی

اردو اور ہندی کی بحث اگرچہ پرانی تھی لیکن اب کچھ دنوں سے اس مسئلے نے جو اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس کا تعلق ادب اور لسانیات کی بجائے سیاسی اغراض اور فرقہ دارانہ تعصبات سے ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ۱۹۲۰ء کی تحریک وطنی کا ایک قدرتی شاخسانہ ہے جسکی ابتدا اس نہایت ہی سادہ اور بہ ظاہر معصومانہ خیال سے ہوئی کہ اگر ہندو اور مسلمان آپس میں اتفاق کر لیں تو حکومت برطانیہ اس امر پر مجبور ہو جائیگی کہ ان کے سیاسی مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ لیکن اتحاد و اتفاق کا یہ ولولہ کچھ بہت زیادہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ اس لئے کہ ہندوؤں کی تاجرانہ ذہنیت جو ہر وقت نفع ذات کے تخمینوں میں معروف رہتی ہے اس امر پر راضی نہ ہو سکی کہ ہندوستان کے سیاسی اور معاشی فوائد میں اپنا حصہ پہلے سے متعین نہ کر لے۔ لہٰذا اول اس تحریک کی ابتدا ہوئی کہ آزاد[1] ہندوستان کے آیندہ دستور کی وضاحت کی جائے۔ پھر دستور آئین کا مسئلہ زیر بحث آیا اور اس کے اصول و دفعات مرتب ہوئے[2] اور آخر الامر یہ قصہ یہاں ختم ہوا کہ تمام ہندوستانی بلا چون و چرا قومیت و وطنیت کو اپنا منتہائے نظر تصور کریں کانگریس اور مہاسبھا دونوں کے طریق کار میں فرق ہے۔ ایک کا زور "ہندوستانیت" پر ہے اور دوسری کا "ہندویت" پر لیکن مقصد دونوں کا ایک ہے اور وہ یہ کہ اس ملک میں اکثریت کی حکومت قائم ہو اور ہندو قومیت، ہندو تہذیب اور ہندو زبان کو رواج دیا جائے۔ کانگریس کے نزدیک ہندوستان کے سیاسی نشو و نما میں کسی فرقے مخصوص تہذیب یا مذہب و ملت کا نام لینا "آئین جمہوریت" کے منافی اور روشن خیالی کی ضد ہے اور ہندو مہاسبھا کا ادعا یہ ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک اور ہندو تہذیب و تمدن کا مرکز ہے۔ اس کی غیر ہندو آبادی کا اس ملک پر کوئی حق نہیں ان معنوں میں کہ وہ یہاں کسی مخصوص مفاد یا مصالح کے تحفظ کا نام لے۔ اب کچھ دنوں سے انقلاب دوس کے زیر اثر بعض لوگوں نے ایک "اجتماعی لائحہ عمل"

---

[1] ۱۹۲۲ء میں جب "مجلس برائے تحقیق خلاف ورزی قانون" کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا ہے تو بابو بھگوان داس نے یہ سوال اٹھایا تھا۔ کہ آزاد ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کا حصہ کیا ہوگا۔

[2] یعنی مجالس اتحاد جن کا سلسلہ فرقہ وارانہ بلووں کے بعد شروع ہوا، کانگریس کی قرار دادیں۔ نہرو رپورٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کا نام لینا شروع کر دیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ موجودہ نظامِ جماعت کو یکسر بدل لیا جائے لیکن اس اشتراکی اور اشتمالی تحریک کا اقتضا بھی قدرتاً یہ ہے کہ اہلِ ہند اپنے تمام امتیازات کو خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہو یا تہذیب و تمدن سے یکقلم خیرباد کہہ دیں اور اپنے آپکو خالصاً ہندوستانی (یعنی گوشت پوست کے وہ انسان جو اس ملک میں بستے ہیں) تصور کرتے ہوئے ایک غیر سرمایہ دارانہ نظامِ جماعت کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں[1]۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کی یہ تمام سیاسی اور معاشی تحریکیں جنکی باگ ڈور اسوقت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اس امر پر مصر ہیں کہ مسلمان اپنے اصولِ حیات کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں اور سیاسی اور اجتماعی معاملات میں اسلام کی بجائے ہندوؤں کے قائم کردہ نظریوں کو اپنا رہنما بنائیں۔

لیکن پچھلے دس پندرہ برس میں ان غیر اسلامی خیالات کے زیرِ اثر مسلمانوں میں "قوم پرستوں" کا جو قلیل سا مجموعہ پیدا ہوا تھا اب اس بات پر متفق ہے کہ "ہماری قومی تحریک کی باگ ڈور جن ہندو رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے ان میں سے اکثر کی ذہنیت نہایت تنگ اور فرقہ پرور ہو گئی ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی آزادی اور ارتقائے قومیت کا مفہوم اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ اس ملک پر ہندو آریائی تمدن کا پورا غلبہ و تسلط ہو جائے اور مسلم تمدن کے آٹھ سو سال کے اثرات حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں[2]۔" اس آریائی اور ہندو تمدن کے غلبہ و تسلط کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اردو کی بجائے ہندی کو مشترکہ قومی زبان بنایا جائے ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ گاندھی جی یا کانگریس کے دوسرے ہنما فرقہ دارانہ تصفیے کیساتھ بیٹھے بٹھائے ایک نیا مسئلہ چھیڑ دیتے۔ کانگریس کے گذشتہ اجلاس کے بعد انہوں نے ہندی کی اشاعت و ترویج کیلئے مختلف اجتماعات میں جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس سے قومیت کے بڑے بڑے راسخ الاعتقاد شیدائیوں کا ایمان بھی متزلزل ہو گیا اور انہوں نے ہندوؤں کی ان کرمیوں پر سختی کیساتھ نکتہ چینی کی۔ گاندھی جی کا ارشاد ہے کہ اردو جسے قرآن کے حروف میں لکھا جاتا ہے مسلمانوں کی زبان ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے سابرمتی آشرم کا یہ سیاسی مہاتما جس نے اچھوت ادھار کا چولا اتار کر دفعتاً ایک ادبی مصر کی حیثیت اختیار کر لی ہے اپنے اس اجتہاد پر کسقدر خوش ہوگا۔ حالانکہ وہ "مشترکہ زبان" جس کی حمایت کا اسے دعویٰ ہے اسقدر محدود اور غیر مستعمل ہے کہ ابھی چند دن ہوئے کانگریس کی مجلس عاملہ میں جب یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس کا منشورِ انتخاب ہندی میں شائع کیا جائے تو مسٹر ستیا مورتی نے یہ کہہ کر اسکی مخالفت کی کہ اس کا سمجھنا لوگوں کیلئے مشکل ہو جائیگا۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز وہ خطبۂ صدارت ہے جو بابو راجندر پرشاد سابق صدر کانگریس نے ہندی ساہتیہ سمیلن ناگپور کے اجلاس میں پڑھا

---

[1] اس ضمن میں پنڈت جواہر لال نہرو کے مختلف بیانات علیٰ ہذا ان کی خود نوشت سوانحعمری کا مطالعہ نہایت مفید رہیگا۔

[2] جامعہ اشاعت جولائی ۱۹۳۵ء ص ۳۸۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کی واحد قومی "یعنی قوم پرست" درسگاہ کا ماہوار رسالہ

اور جس میں انہوں نے بزعم خود اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شمالی ہندوستان میں جو زبان بولی جاتی ہے۔ ہندی ہے وہ کہتے ہیں بڑے بڑے مسلمان ادیبوں نے اسے ہمیشہ ہندی ہی کے نام سے موسوم کیا۔ "شمالی ہندوستان کے سب مسلمان ہندی جانتے اور بولتے ہیں۔ . . . . آج اردو لکھنے والوں میں ایک چال چل گئی ہے کہ فارسی اور عربی کے بڑے بڑے لفظ لاکر اپنے مضمونوں کو بھر ڈالتے ہیں۔ . . . ." اپنے اس خیال کی تائید میں انہوں نے علامہ اقبال مدظلہٗ کی ان دو نظموں کو پیش کیا ہے۔ ۱۔ سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے

یہ بابو صاحب کے نزدیک "ہندی" ہے اور۔ ۲۔ اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور

جی چاہے تو اسے اردو کہہ لیجئے مگر بابو صاحب کی رائے میں یہ بھی ہندی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں مسلمان "چال چل گئے ہیں" اور انہوں نے عربی فارسی کے بڑے بڑے الفاظ اس میں داخل کر دئے ہیں۔ بابو صاحب کہنے کو ایک بات کہہ گئے۔ یا بالفاظِ دیگر چال چل گئے لیکن اتنا نہیں سمجھے کہ جسطرح ان کی اس چال سے اردو ہندی نہیں بن سکتی اسطرح مسلمانوں کی چال سے یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندی اردو بن جاتی۔

گویا ہندوؤں کے تعصب اور کم نظری اور ان کی فرقہ پرور ذہنیت نے صرف یہی غلطی نہیں کی کہ عدل و انصاف کے تمام قاعدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بات پر مصر ہیں کہ ایک نیم مردہ اور غیر مروج بولی کو "مشترکہ زبان" قرار دیں۔ بلکہ وہ اس حقیقت کو بھی جھٹلا رہے ہیں کہ اردو سرزمینِ ہند کی قدرتی پیداوار ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جہاں کہیں ہندوستانی موجود ہیں وہ اپنی صوبوار بولیوں کے باوجود اردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں اور یہی حیثیت اردو کی خارجی دنیا کی نظر میں ہے۔ اس ضمن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ادبی رجحانات یا عام کاروباری السانوں کی لغت اور محاورات کی بحث چھیڑنا غلط ہے اس لئے کہ ایک وسیع اور متحرک زبان میں اختلافات ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ جب کوئی ہندوستانی اپنی صوبوار یا کسی غیر ہندی زبان کو چھوڑ کر بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں ان پر اردو ہی کا اطلاق ہو سکتا ہے، ہندی کا نہیں۔

لہٰذا اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کہ مسلمانوں کا اردو کی حمایت کرنا کسی فرقہ وارانہ جذبے کا نتیجہ نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ زبان جو ہندوستان میں ہر کہیں بولی اور اگر بولی نہیں تو سمجھی ضرور جاتی ہے محفوظ ہو جائے۔ ہمارا ہندی، ہندوستانی یا ہندوستانی کے نئے نئے نام ایجاد کرنا غلطی ہے۔ جی چاہے تو آپ اسکو مشترکہ زبان کہہ لیجئے ورنہ ہندوستان ایک ایسے براعظم میں جہاں تہذیب و تمدن اور مذہب و نسل کا زبردست اختلاف موجود ہے ایک

علہ۔ اس خطبے کا ترجمہ رسالہ جامعہ بابت مئی ۳۶ء میں شائع ہوا ہے۔

"قومی" زبان کا نام لینا۔ ان معنوں میں کہ وہ ایک مشترکہ قومیت اور مشترکہ تہذیب و معاشرت کی ترجمان ہو حماقت ہے۔ ہندوستان میں نہ کوئی مشترکہ قومیت موجود ہے نہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اس خیال کی تائید میں بلادِ اسلامیہ کی وطنی تحریکات کا حوالہ دیتے ہیں یا جو مسلمان اس غلط فہمی میں ہیں کہ انہیں ایک "مشترکہ قومیت" پیدا کرنا ہے وہ یا تو قصداً اپنے کو دھوکا دیتے ہیں یا ممالک کی ان تحریکات اور اسلام کے ملی اور اجتماعی نصب العین کا مطلب نہیں سمجھتے لہٰذا اردو کی حفاظت میں ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کو اس مہمل خیال پر متنبہ کریں جو بعض حلقوں میں مصلحتاً پیدا ہو چلا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو ہندو مسلم اتحاد، ایک قومی زبان اور مشترکہ قومیت کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کو جس امر کی ضرورت ہے وہ صرف ہندو مسلم مفاہمت ہے۔ مشترکہ قومیت یا قومی زبان کا تخیل ایک لغو سی بات ہے اس لئے کہ مسلمانوں کی قومیت ہمیشہ اسلام ہی رہیگی اور اس میں کسی دوسری قومیت یا تہذیب کا پیوند لگانا گویا اس کی نفی کرنا ہے۔ رہا زبان کا معاملہ کہ ہم ایک ملک کے باشندے ہیں اور ہمیں شب و روز ایکدوسرے سے سابقہ پڑتا ہے تو یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو اپنا راستہ خود طیار کر لیتی ہے اور اردو کی موجودہ شکل میں اسوقت بھی موجود ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہندو مسلمانوں اور مسلمان ہندوؤں کیلئے ایک مشترکہ ادب پیدا کرنیکی کوشش کریں۔ انکی یہ کوشش نہ صرف ناکام بلکہ حد درجہ مضحکہ خیز ثابت ہوگی اور اسکی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے بعض نافہم مسلمان "مادرِ ہند کی آنکھوں کا تارا گاندھی" پر وجد کرتے ہوئے پیجامے کی بجائے دھوتی اور سلام کی جگہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر پرنام کرتے پھرتے اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ دنیا میں آزادی اور سچائی کے خدائی فوجدار ہیں۔ ادب کی تخلیق قوموں کی مخصوص روح اور انکے ملی جذبات اور واردات کے ماتحت ہوتی ہے لہٰذا ہندو اور اسلامی ادب کے ماورا ایک تیسرا 'قومی' ادب پیدا کرنا یا تو ادب کی جگہ "بےادبی" کی حمایت اور یا ہندو تہذیب اور اسلام دونوں کی نفی سے اس کیلئے ایک نئی اساس اور نیا مشمول تلاش کرنا ہے، حالانکہ اگر کبھی ایسا ہوا تو اس کے نتائج مسلمانوں کیلئے نہایت خوفناک ہونگے۔

اس نام نہاد قومی زبان کیلئے ہماری پہلی قربانی یہ تھی کہ اردو کے لئے ہندستانی کا نام تجویز ہوا اس کے بعد سماج اور سامراج قسم کے الفاظ کا استعمال کیا گیا اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوؤں کے خوف سے وسعتِ خیال اور رواداری کے نام پر تاریخِ ہند کی تعبیر میں خود "قوم پرست" مسلمانوں کی طرف سے یہ آریہ سماجی قسم کا اجتہاد شروع ہوا کہ "سکھوں اور مرہٹوں کا ایک مطلق العنان اور استبداد پسند حکومت کیخلاف لڑنا بجائے خود سزاوارِ تحسین تھا![1]" اگر اس تمام عجز و نیازمندی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندو زبان کے معاملے میں کسی مفاہمت پر آمادہ ہو جاتے تو خیر غنیمت تھا لیکن وہاں بیرخی اور بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ان "قوم پسندانہ" عرض داشتوں میں سے کسی کی شنوائی نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں جب اکثریت

[1] رسالہ جامعہ اشاعت جولائی سنہ ۳۶ء ایڈیٹر جامعہ کے نام کھلی چٹھی اور اس کا جواب۔

کسی رواداری یا منصفانہ برتاؤ کیلئے تیار نہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک "ہندوستانی" زبان کیونکر پیدا کیجائیگی اور کس کیلئے اور سب سے بڑھکر یہ کہ اسکی ضرورت ہی کیا ہے؟

دراصل "قومی" زبان کا مسئلہ ہندوؤں کی بساطِ سیاست کا ایک مہرہ ہے جسے کانگریسی شاطروں نے نہایت ہوشیاری کیساتھ تمام اجتماعی مسائل میں پھیلا رکھا ہے۔ اردو کی حمایت کیلئے اسوقت سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ قومیت و وطنیت کے نام پر مکر و فریب کا جو دام بچھایا گیا ہے اس کا تار و پود بکھیر دیا جائے جس طرح مسلمانانِ ہند کے سیاسی ارتقا اور حفظ و بہبودی کا راز اس ایک اسلامی تحریک میں مضمر ہے بعینہ اردو زبان کی ترقی اور بقا اس امر پر موقوف ہے کہ ہم "قومی" سیاست کے موجودہ شور و غل سے کان بند کرتے ہوئے ایک ایسے ادب کی تخلیق پر آمادہ ہو جائیں جو ہمارے افکار و جذبات اور واردات قلبی کا صحیح آئینہ ہو اور جس میں حقائق کی تجلی کے ساتھ ساتھ شور و ذات کی ایک واضح جھلک نظر آئے لیکن اس کیلئے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے فہم کا حقیقی ذوق شرط ہے۔ کیا ہمارے نوجوان ادیب اور شعرا و مصنف اس امر کی کوشش نہیں کرینگے کہ ایک اجنبی تہذیب اور جھوٹی تعلیم کے زیرِ اثر جو غلط رجحانات ہمارے ادب میں پھیل گئے ہیں ان کی بجائے زندگی کے متین اور سنجیدہ مباحث کی طرف متوجہ ہوں اسلئے کہ جب تک کوئی قوم اپنے سرچشمۂ حیات سے اتصال پیدا نہیں کرتی اس کا زندگی کے انعامات اور اس کی لازوال برکتوں سے مستفیض ہونا دشوار ہے۔

جس طرح ادب میں صحیح تنقید ایک تعمیری عنصر ہے جس سے مذاقِ سلیم کی پرورش اور ابتذال اور سوقیت پسندی کا ازالہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عوام الناس کی جہالت اور لاعلمی بظاہر اپنی علمی سہولتوں کے عذر میں ہمیشہ زبان کی تخریب پر آمادہ رہتی ہے۔ اس کا علاج ایک حد تک "جبر" ہے لیکن ہندوستان میں سردست اس کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ ہم اس کی بجائے ذرائع نشر و اشاعت سے کام لیتے ہوئے اپنی زبان کو انگریزی کے غیر ضروری عنصر اجنبی اور نامانوس تراکیب اور بھونڈے اور ثقیل یا بازاری الفاظ سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہماری ادبی انجمنوں اور رسائل و جرائد کا فرض ہے کہ اس امر کے اعلان کے ساتھ ساتھ کہ اردو کا نام اردو ہی رہے گا اور وہ ہندوستان کی سب سے زیادہ عام فہم اور مستعمل زبان ہے ایک سطحی مبتذل اور ارزاں ادب پیدا کرنے کی بجائے بول چال اور خیالات و ضروریات کے اظہار میں عوام کی رہنمائی کریں "ہماری آنٹی آئی ہیں" اور "آپ کچھ ڈس گسٹڈ سے نظر آتے ہیں" اس قسم کا طرزِ کلام "تعلیم یافتہ" طبقے میں عام ہے۔ محبانِ اردو کو چاہئیے کہ ان لوگوں کی بے زبانی پر رحم کھائیں۔ اور "اردو تیس دن میں" یا اس قسم کی دوسری مہموں کے ذریعے ان میں یہ احساس پیدا کریں کہ قوتِ ادا ایک

ضمیمہ

اچھوتوں کی مشکلات کا حل میرے مذہب میں ہے

چوہدری غلام احمد پرویز بی اے

۲۲ اگست کی شام کو رائل ہوٹل شملہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے مصرعہ بالا عنوان پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اسلام کی نمایندگی کا شرف میرے حصہ میں آیا۔ چونکہ مسئلہ زیر نظر مقامی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہے اس لئے احباب کے تقاضا پر اپنی تقریر کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پرویز

صدر محترم و برادرانِ عزیز! بعض احباب کہا کرتے ہیں کہ ایسے اجتماع میں ہر مذہب کا نمایندہ دنیا بھر کی اچھی اچھی باتیں اپنے مذہب سے منسوب کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کا کچھ یقینی علم نہیں ہوتا کہ وہ باتیں اس کے مذہب میں ہیں بھی یا نہیں۔ اس لئے میں ایسے بھائیوں کی اطلاع کے لئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں سند اور حوالہ کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ یہ کتاب کوئی گپت دور یا مخفی علم نہیں ہے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور ہر بڑے کتب فروش کی دکان سے مل سکتی ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا اسی کتاب کے حوالہ سے کہوں گا جس بھائی کا جی چاہے خود کتاب اٹھا کر اپنا اطمینان کر لے۔ نیز یہ بھی معلوم رہے کہ یہ کتاب آج سے تیرہ چودہ سو سال پیشتر سے دنیا میں موجود ہے۔ اس لئے ہم پر یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ ہم کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ کا حل پیش کرتے ہیں اس لئے کہ یہ حل ہمارے دماغوں کی اختراع نہیں ہے بلکہ صدیوں پہلے سے ایک جگہ لکھا ہوا چلا آ رہا ہے۔

میرے محترم پنڈت بدھ دیو جی نے فرمایا ہے کہ اچھوتوں کا مسئلہ خالص ہندوؤں کا مسئلہ ہے مسلمان خواہ مخواہ اس میں کود پڑے ہیں[1]۔ سو میں ان کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لئے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مظلوم کی فریاد رسی کے لئے اسے ہندو اور مسلمان میں تمیز کرنے کی اجازت ہی نہیں اسے حکم دیا گیا ہے

---

[1] یہ جلسہ انجمن احمدیہ کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔

الخلق عیال اللہ وحبیرکم انفع لعیالہ (حدیث) یعنی تمام نوع انسانی بلکہ سب مخلوق ایک خدا کا کنبہ ہے۔ اور تم سب میں سے اچھا وہ ہے جو خدا کے اس کنبہ کو سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہے مسلمان کا خدا رب العالمین ہے مسلمان اور ہندو۔ ادنیٰ و اعلیٰ۔ نیچے اور اونچے۔ گورے اور کالے سب کا خدا ہے اس لئے اس کا حکم ہے کہ جو میرے بندے ہیں وہ اسی طرح بلا تمیز مذہب و ملت بلا تفریق زبان و رنگ ہر انسان کی خدمت کے لئے تیار رہیں۔ مسلمان تو گویا آگ بجھانے والے انجن کے فائرمین کی طرح ہے کہ جب اسے یہ ٹیلیفون ملے کہ فلاں جگہ آگ لگ رہی ہے تو آگ خواہ شوالہ میں ہو یا مسجد میں مسلمان کے گھر ہو یا ہندو کے اس کا فرض ہے کہ فوراً موقعہ پر پہنچے۔ دوسروں کی آگ میں کود پڑے اور جب آگ بجھ جائے تو ایک پیسہ لئے بغیر واپس چلا آئے کہ جب اس سے کہا گیا تھا کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر تو یہ کمیں تخصیص نہیں کی گئی کہ نیکی کا حکم کرنا اور برائی کو روکنا۔ عدل و انصاف کو پھیلانا اور ظلم و دراز دستی کو بند کرنا محض مسلمانوں کے حلقہ تک ہی محدود رہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ حلقہ تمام نوع انسانی تک وسیع ہے! ایک مسلمان چلا جا رہا ہو۔ اوپر سے ایک بچہ سڑک پر آ گرے۔ اس مسلمان کو یہ نہیں چاہئے کہ معلوم کرے کہ بچہ مسلمان کا ہے یا ہندو کا۔ کسی کا ہو۔ انسان کا بچہ تو ہے۔ گود میں اٹھا لے۔ ہسپتال میں لے جائے اور اس کا علاج شروع کرا دے لیکن اگر اتنے میں بچہ کا باپ آ کر یہ کہے کہ بچہ تو ہمارا تھا۔ تو کون ہوتا تھا اسے اٹھا کر لانے والا۔ تو آپ خود ہی فرمائیے کہ اس کا کیا جواب! ہوا صرف یہ کہ رات کا وقت تھا۔ محلہ کے ایک مکان سے چیخ و پکار کی آواز آئی معلوم ہوا کہ فلاں ہندو بھائی کے لڑکے کو ہیضہ ہو گیا ہے۔ کسی کے پاس امرت دھارا تھا وہ لے کر دوڑا کسی کے پاس کلورو ڈین تھی اسے اٹھا بھاگا۔ ایک مسلمان ہمسایہ کے پاس تریاق ہیضہ کی شیشی تھی وہ بھی لے گیا۔ آپ ذرا تصور میں لائیے کہ امرت دھارا والے کا بھی شکریہ ادا کیا جائے۔ کلورو ڈین والے کو بھی دھن باد کہا جائے۔ لیکن اس تریاق والے مسلمان کو ڈانٹ دیا جائے کہ ہمارے مریض سے تمہیں کیا واسطہ یہ ہمارے اپنے گھر کا معاملہ ہے تم کیوں خواہ مخواہ کود پڑے!! میرے ایک بالیک بھائی نے کہا ہے کہ اسے اس کی قوم کا درد اسٹیج پر کھینچ لایا۔ اچھوت اگر اس کی قوم کے فرد ہیں تو میرے خدا کے بھی تو بندے ہیں۔ اسلام ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ تمہاری ہمدردیاں حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہونی چاہئیں کہ

مسلم ہو تم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
وللہ المشرق والمغرب

اس لئے محترم سوامی جی! ہمارے نزدیک یہ مسئلہ نہ ہندوؤں کا ہے نہ مسلمانوں کا۔ بلکہ انسانیت کا مسئلہ ہے اور ہر وہ انسان جس کے سینہ میں دل اور دل میں مظلوم کی محبت کا جذبہ موجود ہے اسے اس مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھنا چاہئے کہ

یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان کہ کام آئے دنیا میں انسان کے انسان

اب میں اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں سوال یہ ہے کہ اچھوتوں کی مشکلات کا علاج کیا ہے! علاج کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ اپنے بازار میں بڑے بڑے اشتہار دیکھے ہونگے۔ پین پروف۔ منٹ کیور۔ سر سے پاؤں تک کے دردوں کے لئے ایک ٹکیہ۔ واقعی وہ ٹکیہ ایسی ہوتی ہے کہ گرم پانی سے کھاؤ۔ جہاں کہیں درد ہوگا۔ ایک منٹ میں بند ہو جائیگا۔ لیکن حاذق طبیب سے پوچھئے کہ یہ کیا طریق علاج ہے۔ وہ کہدیگا کہ علاج کیا یہ تو الٹا مرض ہے۔ درد اس وقت کے لئے تو بند ہو جائیگا۔ لیکن جب پھر ابھریگا تو دگنی شدت سے ابھرے گا اصل علاج یہ ہے کہ پہلے اس بات کی تشخیص کی جائے کہ علت مرض کیا ہے۔ مرض پیدا کس وجہ سے ہوا۔ اور جب اس کا پتہ چل جائے تو اس علت مرض کو بدن سے نکالا جائے۔ مریض ہمیشہ کے لئے اچھا ہو جائیگا اچھوتوں کو کونسل میں نشستیں دیدو۔ میونسپلٹی کا پریذیڈنٹ بنا دو۔ ان کے بچوں کو مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں بھیجدو۔ معاف رکھئے۔ یہ سب منٹ کیور ہیں۔ اصل مرض کا علاج نہیں ہیں۔ دیکھنا ہمیں یہ چاہئے کہ اچھوت اچھوت بنے کیوں۔ یہ مرض پیدا کیسے ہوا۔ مجھے کسی کے مذہب پر تنقید کرنا مقصود نہیں۔ نہ کسی کو برا کہنا مطلوب ہے کہ میرے مذہب میں کسی کا خواہ مخواہ دل دکھانا قطعاً جائز نہیں۔ لیکن اتنی بات تو سب کو معلوم ہے اور خود بالمیکی بھائیوں نے بھی ایسا کہا ہے کہ نیچ ذات کے گھر پیدا ہونے والے بچے کو جنم کا نیچ سمجھا جاتا ہے۔ اور اونچے گھر میں جنم لینے والے بچے کو جنم کا اونچا۔ اسی سے ذاتوں اور دانوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ (یہاں پر بعض ہندو بھائیوں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ ہم ایسا نہیں مانتے[1]۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اسے غلط سمجھتے ہیں تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ معافی مانگتا ہوں۔ پھر تو سارا معاملہ ہی حل ہو گیا۔ ہندو دھرم کی بنیاد ہم تو اسی تناسخ اور جنم کے مسئلہ پر سمجھتے تھے۔ اگر یہی غلط ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ چونکہ یہ مجلس مناظرے کی نہیں ہے۔ اور نہ میں بحث مناظرے کو اچھا سمجھتا ہوں اس لئے میں بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ اس لئے میں پنڈت بدھ دیو جی کے الفاظ میں

---

[1] اس سے پہلے پنڈت بدھ دیو جی نے بھی فرمایا تھا کہ ہم غلطی سے جہالت سے اتنی مدت تک اچھوتوں کو نیچ سمجھتے چلے آئے اسلئے اب ہم نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا ہے۔ اسلئے اپنا سدھار خود کر رہے ہیں۔

یہ کہوں گا کہ غلطی سے جہالت سے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ نیچ جنم کا بچہ نیچ ہوتا ہے۔ بس یہ ہے مرض کی تشخیص جسکو آپ غلطی سے جنم کا نیچ سمجھتے ہیں۔ وہ عمر بھر محسوس کرتا رہتا ہے کہ میں نیچ ہوں۔ اونچا نہیں ہو سکتا۔ اس کو اگر آپ بڑی بڑی رعایتیں دیں۔ عزت اور وقار کی پوزیشن بھی دیں۔ تو وہ ان چیزوں کو اپنا پیدائشی حق نہیں سمجھتا ایسا ہی سمجھتا ہے جیسے ایک بھکاری کو بھیک دے دی جائے۔ دینے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے احسان کیا۔ مروت کی۔ لینے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا حق تو نہیں تھا۔ ان کی کرپا ہے دیا ہے جو ہمیں بھی ایسا سمجھتے ہیں۔ اس لئے دینے والوں میں تکبر اور بڑائی اور لینے والوں میں ذلت اور پستی (Inferiority - Complex) کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ خوشی اسی چیز کے لینے میں ہوتی ہے جسے انسان اپنا حق سمجھ کر لے۔ یہ وہ بات ہے جسے قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس پیشتر کہا اور کھلے کھلے الفاظ میں کہا۔ یاد رہے کہ قرآن کریم اپنے متعلق کہتا ہے کہ ھو شفاء لما فی الصدور وہ دل کی بیماریوں کا علاج ہے۔ اصل مرض کو رفع کرنیوالا تریاق ہے۔ منٹ کیور نہیں ہے اور جب من کے روگ درست ہو جائیں تو شریر کے روگ سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

من کے ہارے ہے ہارے۔ من کے جیتے جیت

قرآن کریم تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ۔ ۴:۱	اے انسانو! اپنے اس رب سے ڈرتے رہو جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا۔

یعنی پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی جنم کا نیچ یا اونچ نہیں ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ برابر کے حقوق لیکر دنیا میں آتا ہے سب بچوں کو دنیا کے وسیع میدان میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور کہدیا جاتا ہے کہ یاد رکھو (لیس للانسان الا ما سعی) ہر انسان کو اس میدان میں وہ کچھ ملیگا۔ جس کے لئے وہ کوشش کریگا جتنی کوشش کریگا اتنا ہی پھل حاصل کریگا۔ جو زیادہ دوڑیگا وہی سب سے آگے ہوگا۔ اس میدان میں کہیں یہ بورڈ نہیں لٹک رہا کہ فلاں جنم کا بچہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ

ولکل درجت مما عملوا۔ وما ربک بغافل عما یعملون۔ ۶:۱۳۳	ہر شخص کا رتبہ اور درجہ اس کے کام کے لحاظ سے ہے اور تیرا خدا کسی کے کام سے غافل نہیں ہے۔

درجے اور رتبے جنم سے نہیں ۔کرم سے ہیں جو اچھے کرم کریگا اسی کے رتبے بڑے ہونگے ۔خواہ وہ جنم کا اچھوت ہو یا برہمن ۔

یہ تو رہا جنم اور پیدائش کا سوال ۔اب یہ ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے کسی کو نیچ یا اونچ سمجھنا تو اسلام اسکے بھی خلاف ہے ۔مسلمانوں کے نزدیک سوائے اس پیشہ کے جس میں انسان اپنی عزت و آبرو کھو کر اپنی انسانیت ضائع کرکے کچھ کمائے اور کوئی پیشہ قابل نفرت نہیں ۔ہمارے رسول کریم کا ارشاد ہے کہ ا لکاسب حبیب اللہ ہر کمائی کرنے والا ۔پیشہ ور ۔ اللہ کا دوست ہے ۔اس لئے ادنیٰ سا پیشہ بھی اس کے نزدیک قابل عزت ہے یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے غلاظت اٹھانے والے "اچھوتوں کو " حلال خور" کا لقب دیا اور یہ لقب کوئی معمولی لقب نہیں ہے ۔ان کے ہاں بڑے خدا پرستوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اکلِ حلال اور صدقِ مقال پر پابند ہے ۔یعنی حلال خور ہے ۔اور سچ بولتا ہے ۔ان کے مہتر ہوئے جسکے معنی ہیں بہت بڑا اور ان کے پیشے کی وجہ سے کبھی ان سے نفرت نہیں کی ۔اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ آج مکہ معظمہ میں جائیے ۔کعبہ کو مسلمان سب سے زیادہ مقدس اور پوتر سمجھتے ہیں ۔وہیں وہ لوگ بھی ہیں جو بھنگیوں کی طرح غلاظت اٹھاتے ہیں ۔لیکن جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو وہی بھنگی ۔نہا دھو کر کعبہ کی سب سے پوتر مسجد میں آ جاتے ہیں اور ایک بادشاہ کے ساتھ برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں کوئی ان سے نفرت نہیں کرتا ۔

برادران ! وقت نہیں ہے ۔(صاحب صدر نے کہہ دیا تھا کہ تین منٹ اور ہیں) ورنہ میں عرض کرتا کہ اس تعلیم پر مسلمانوں نے عمل کرکے کس طرح دکھایا ۔خود رسول اللہ نے کس طرح عمل کیا اور عرب کے غلام ۔ جن کی حالت یہاں کے اچھوتوں سے بھی بدتر تھی ۔ان غلاموں کو کس طرح بڑے بڑے خاندان والوں پر حاکم و سپہ سالار مقرر کر دیا ۔صحابہ کبار اپنی غلاموں کی کس قدر تعظیم و توقیر کرتے تھے ۔دور کیوں جاؤ ۔خود ہندوستان میں غلاموں کے خاندان نے حکومت کی ۔مصر میں مملوک بادشاہ ہوئے جو غلام تھے ۔غلاموں کو بادشاہ بنا دینا اسلام کی تعلیم کا ہی اثر تھا ۔سو لے بھائیو ! اسلام کا خدا اپنے آپ کو رب العالمین کہتا ہے جس کے معنی ہیں تمام دنیا جہان والوں کا پالن ہار ۔خواہ وہ غریب ہوں یا امیر ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ ۔ہندی ہوں یا عربی ۔اس کا قرآن ۔ذکر للعلمین ہے ۔جس کا مطلب ہے کہ وہ تمام دنیا کے لئے خدا کا پیغام اور سچا اپدیش ہے ۔خواہ سننے والا اچھوت ہو یا سید ۔اور اس کے رسول کے متعلق فرمایا کہ رحمتہ للعلمین ۔وہ ساری دنیا کے

لئے دیا کرنے والا ہے۔ خواہ وہ نیچ جاتی کا ہو یا اونچے ورن کا۔ لہٰذا اسلام وہ سمندر ہے کہ جس میں جو قطرہ آملا خود سمندر ہو گیا۔ اب دنیا کی کوئی آنکھ تمیز نہیں کر سکتی کہ وہ قطرہ جواب آکر اس میں ملا تھا۔ کون سا ہے۔

بھائیو! یہ ہے میرے مذہب میں اچھوت بھائیوں کے مرض کا علاج جس کا جی چاہے اس نسخہ کو استعمال کر دیکھے نسخہ پیش کر دینا ہمارا فرض تھا جو قبول کر کے ہمارا شکریہ ادا کریگا۔ وہ خود اسکے فوائد پر کھ لیگا۔ اور جو ہمیں یہ کہہ کر دھتکار دیگا کہ تمہیں ہمارے مریض سے کیا تعلق وہ خود خسارے میں رہیگا کہ ہم کسی دنیاوی غرض اور مقصد کیلئے یہ علاج نہیں بتاتے بلکہ محض اسلئے کہ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ میری مخلوق پر جہاں جہاں بھی کوئی مصیبت آئے تمہیں اس مصیبت زدہ کی مدد کرنی ہو گی۔ ورنہ تم سے جواب طلب کیا جائیگا۔

تقریر یہاں ختم ہو گئی تھی کہ بیس منٹ میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاتا۔ لیکن دوران تقریر میں ایک ہندو صاحب نے دو ایک سوال کئے جنکا اعادہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ جب میں نے قرآن کریم کی آیت سے یہ بتایا کہ جنم کے لحاظ سے تمام انسان برابر ہیں تو اس صاحب نے پوچھا کہ پھر تم دوسروں کو کافر کیوں کہتے ہو میں نے کہا کہ بھائی! کافر کوئی گالی نہیں ہے۔ کوئی حقارت یا نفرت کا لفظ نہیں ہے۔ آپ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ کچھ لوگ اس سوسائٹی کے ممبر ہوتے ہیں۔ باقی لوگ نہیں ہوتے۔ سوسائٹی کے اراکین کو آپ (members) اور غیر اراکین کو (Non - members) کہتے ہیں۔ بس اتنا ہی فرق ہے مسلم اور کافر میں۔ اسلام کی سوسائٹی کا ممبر مسلم۔ اور Non - members کا نام ہے کافر۔ اس میں حقارت اور نیچ سمجھنے کا سوال کیسا۔ اس نے پوچھا کہ کافر کے معنی کیا ہیں۔ میں نے کہا کہ "نہ ماننے والا" اس نے کہا کہ "کیا نہ ماننے والا" میں نے کہا کہ اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط کو "نہ ماننے والا"۔ اس نے کہا کہ جو آیت تم نے پڑھی ہے۔ (یا ایہا الناس اتقوا ربکم) اس میں کافروں کا تو ذکر نہیں کہ ان کو بھی جنم کے لحاظ سے ایک جیسا سمجھو۔ میں نے کہا کہ اس میں مخاطب ہیں الناس جس کے معنی ہیں تمام انسان۔ نوع انسانی (Human beings) اور یہ ظاہر ہے کہ انسانوں میں مسلم و کافر سب آجاتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اے "مسلمانو! تم سب جنم کے لحاظ سے برابر ہو"۔ بلکہ اس نے کہا ہے کہ اے تمام انسانو! تم سب کو ہم نے ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے تم سب پیدائش کے اعتبار سے برابر ہو۔

اس سے غالباً وہ صاحب مطمئن ہو گئے

استقلال افغانستان

ادارہ

مشرق کی تین عظیم الشان اسلامی سلطنتوں یعنی ایران، ترکی اور اسلامی ہند کے زوال کے ساتھ افغانستان کی جغرافی حیثیت کو روس اور انگلستان کی نظر میں جو اہمیت حاصل رہی ہے اس کی تاریخ پچھلی صدی کے آغاز یعنی مغرب کی ان دونوں سلطنتوں کی اس کوشش سے شروع ہوتی ہے کہ وہ اس ملک کو ہندوستان کی حفاظت یا اس کی تسخیر کے لئے اپنے زیر اثر رکھیں۔ یہ کوششیں جیسا کہ سب کو معلوم ہے روس کی ناکامی اور انگریزی حکمت عملی کی مکمل فتح پر ختم ہوئیں۔ ۱۹۱۹ء تک افغانستان کے خارجی معاملات انگریزوں کے ہاتھ میں تھے اور افغان اس امر کے مجاز نہیں تھے کہ دوسرے ممالک سے آزادانہ روابط قائم کر سکیں۔ گویا سیاسی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے افغانستان پر برطانوی سیادت قائم تھی۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں جب مغرب میں جنگِ عظیم کے بعد ان زبردست فتنوں کی ابتدا ہوئی جنکا سلسلہ اسوقت تک جاری ہے تو دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اہلِ افغانستان نے بھی اپنے حقِ استقلال اور جذبہ خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ قوموں کی ترقی اور از سرِ نو زندگی کا انحصار دو باتوں پر ہے خارجی اثرات سے آزادی اور بیداریٔ ذات۔ خوش قسمتی سے ۱۹۱۹ء میں فضا سازگار تھی۔ افغانوں کے ولولہ آزادی نے جوش مارا اور ان مختصر سے واقعات کے بعد جو ہندوستان کے بچے بچے کو معلوم ہیں۔ افغانستان کا شمار بھی دنیا کے نوخیز اور خود مختار ممالک میں ہونے لگا۔

گویا ۱۹۱۹-۲۰ء سے لے کر اسوقت کم و بیش پندرہ برس گذر چکے ہیں جب افغانستان نے بین الاقوامی دنیا میں قدم رکھا لیکن افسوس یہ ہے کہ پندرہ یا سولہ برس کی مدت جو کسی قوم کے ارتقا یا بیداریٔ ذات کے جائزے میں ادنی سی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ اندرونی انقلابات اور آفات و مصائب سے خالی نہیں رہی۔ ہمارا مطلب ہے اس انقلاب سے جو بچہ سقہ کے خروج اور شاہ امان اللہ خاں کے عزل و فرار سے شروع ہو کر فتح نادری پر ختم ہوا۔ افغانستان کی عزت و وقار اور اس کے سیاسی اور معاشی مفاد کو غالباً نصف صدی کے انگریزی تغلب سے اس

قدر نقصان نہیں پہنچا جتنا اس ایک خانہ جنگی سے ڈر تھا کہ نوجوان افغان جنہیں آزادی کی فضا میں سانس لیتے ابھی چند ہی سال گذرے تھے اور جنہیں اس راہ میں قدم قدم پر امتحان اور آزمائشیں درپیش تھیں بد دل ہو کر ہمت ہار دیں یہ ان کی خوش بختی اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ بچہ سقہ اور اس کے ہمراہیوں نے تاخت و تاراج کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اعلیٰ حضرت شاہ شہید کے غیر معمولی ایثار، شجاعت اور دانشمندی کی بدولت بہت جلد رک گیا۔ جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے بچہ سقہ نے صرف ملک کے امن و رفاہیت ہی کو تباہ و برباد نہیں کیا جسکا تعلق عہد بانی کی برکات سے تھا بلکہ اسوقت افغانستان کی آزادی اور استقلال بھی خطرے میں تھا۔ لہٰذا اس نظر سے دیکھا جائے تو شاہ شہید علیہ الرحمتہ کی عظمت و بزرگی کا بے اختیار قائل ہونا پڑتا ہے۔ امان اللہ خاں کے عہد میں ان کی غیر معمولی قابلیت اور اثر و رسوخ افغانستان کی قوت و طاقت کا رکنِ رکین تھا اور امان اللہ خاں کے بعد یہ انہیں کا حزم و تدبر اور عزم و بلند ہمتی تھی جس نے افغانوں کے اندر خدمتِ وطن اور اسلام کے لئے غیرت و حمیت کا صحیح جذبہ پیدا کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ استخلاصِ وطن کی مہم پر بعض حلقوں میں شاہ شہید کی سرگرمیوں کے متعلق قصداً بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں اور چونکہ مشرق میں ابھی سیاسی فہم و تدبر کی کمی ہے اور طبائع ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتی ہیں، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن جوں جوں لوگوں کے اندر سیاسی مسائل اور بین الاقوامی معاملات کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی جائیگی، ان باتوں کا خود بخود انسداد ہو جائیگا۔

بہر کیف استقلالِ افغانستان کی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس پندرہ یا سولہ برس کی مدت کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑیگا۔ افغانستان کی آزادی اور مطلق العنانی کا پہلا دور جو تیسری افغانی جنگ (انگریزوں کے نزدیک یا جنگِ استقلال) سے شروع ہو کر شاہ امان اللہ خاں کے عزل و اخراج پر ختم ہوا۔ اور اس کا دوسرا دور وہ ہے جو شاہ شہید علیہ الرحمتہ کی پادشاہت سے لے کر بفضلہ تعالےٰ اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ قائم ہے۔

امان اللہ خاں کا دس سالہ عہدِ حکومت افغانستان کی تاریخ میں ایک نہایت ہی روشن اور زریں باب ہے۔ وہ اپنے دل میں خدمتِ وطن کا زبردست ولولہ رکھتے تھے اور ان کی حریت پسند طبیعت نے انہیں اسوقت تک چین نہیں لینے دیا جب تک خارجی اثرات کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ جو افغانستان میں موجود تھا، مٹا نہیں دیا گیا۔ محض استقلال اور بین الاقوامی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے تو حکومتِ کابل کا اولین فرض یہ تھا کہ اقوامِ عالم میں اپنی عزت اور وقار قائم کرے۔ چنانچہ آئینِ حکومت کی اصلاح و تبدیلی اور ملک کے نظم و نسق

کے ساتھ امان اللہ خاں نے عساکر کی تعلیم و تربیت، اندرونی استحکامات، صنعت و حرفت، تجارت کی ترقی، علوم و فنون کی اشاعت اور بیرونی تعلقات کی استواری میں جس تیزی سے قدم اٹھایا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں ان کی حکمتِ عملی یہاں تک کامیاب ہوئی کہ سفر یورپ میں بڑی سے بڑی مغربی سلطنتوں کو بے اختیار افغانستان کے اس جلیل القدر تاجدار کا نہایت عزت کے ساتھ خیر مقدم کرنا پڑا۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ امان اللہ خاں کی عجلت پسندیاں اور شوقِ تجدد اوران کے اعیانِ دولت اور رفقائے کار کی نمائش پرستی اور مغرب کی سطحی تقلید نے وقتہ اس دورِ کامرانی کو ختم کر دیا اور ملک کا سارا مال و دولت اور انتظامات و اصلاحاتِ ستوی انقلاب کی نذر ہو گئے۔

لہٰذا نادر شاہ غازی کے سامنے ایک نہیں کئی ذمہ داریاں تھیں۔ 'استخلاصِ وطن' بیرونی مداخلت کا (اگر اس کا امکان ہو) ازالہ اور ملک کی از سرِ نو تعمیر۔ اعلیٰ حضرت شاہ شہید اور ان کے بعد افغانستان کی موجودہ حکومت نے جس کامیابی اور غیر معمولی سرعت کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک امن و امان کا دور دورہ ہے۔ اس کی سرحدیں محفوظ ہیں اور فوجی استحکامات اور حربی طاقت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ پر فوجی چھاؤنیاں اور اسپتال قائم ہیں۔ عساکر کی قواعد و تربیت میں بہتر سے بہتر ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ افغانستان جو کبھی لامرکزیت اور انتشار و پراگندگی کا مرکز تھا اب ایک وطن خواہ اور روشن خیال حکومت کا پابند ہے جسے افغانوں کے مخصوص حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جدید ترین سیاسی اور عمرانی تصورات کے ماتحت منظم کیا گیا ہے۔ حکومت کا طریق آئینی ہے جس میں صدر اعظم اپنا کابینہ وزارت خود مرتب کرتا ہے۔ ملک کا سارا نظم و نسق مختلف وزارتوں کے ہاتھ میں ہے اور اگرچہ انتخاب مندوبین اور حق رائے دہندگی کی وہ صورت جو بحالت موجودہ مغرب میں رائج ہے افغانستان میں کسطرح ممکن نہیں پھر بھی افغان جرگہ یا مجلس شوریٰ ملی جس کے ارکان تمام سمتوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ رعایا کے جذبات و خواہشات کو معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ افغان اپنے بادشاہ اور افغان بادشاہ اپنی افغان رعایا کو دوستی اور محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ملک کی اندرونی اصلاح اور رفاہ و ترقی کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک سے بھی سیاسی تعلقات کا سلسلہ جاری ہے۔ وزارتِ حربیہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ قدیم معاہدات کی تصدیق کرائی اور امریکہ یورپ اور ایشیا کے تقریباً تمام ممالک سے دوستانہ روابط قائم کئے اسلامی دنیا میں

افغانستان، ایران، عراق اور جمہوریہ ترکیہ کے اس اتحاد پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا گیا جو ابھی حال ہی میں ان چاروں اسلامی ریاستوں کے درمیان باہمی دفاع و حفاظت کیلئے مرتب ہوا۔ یہ امر اطمینان کے قابل ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں اعلیٰ درجے کی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سلسلہ رسل و رسائل کی سہولت کے لئے اک تار، لاسکی اور ٹیلیفون کے انتظامات ہر جگہ موجود ہیں۔ بندہائے آب کی تعمیر اور نہروں کے ذریعے بہت سے رقبے جو پہلے کاشت میں نہیں آتے تھے اب عمدہ سے عمدہ فصلیں پیدا کر رہے ہیں۔ وزارت تجارت نے بنک ایوانِ تجارت، مراکز نمایندگی اور صنعتی تعلیم کو خاص طور سے ترقی دی ہے۔ اور اس کی نگرانی میں مختلف مقامات پر طرح طرح کے کارخانے کھول دئے گئے ہیں۔ برقی روشنی اور برقی طاقت کی پیدا آوری کی طرف خاص توجہ ہے۔ حکومت نے آثار کی حفاظت و مرمت کے ساتھ ساتھ نئی نئی عمارتوں کی تیاری، شہروں اور قصبوں کی صفائی از سرِ نو تعمیر اور دکانوں اور ہوٹلوں پر بڑی بڑی رقمیں صرف کی ہیں۔ وزارت عدلیہ کی اصلاح و وسعت اور وزارت معارف کی خدمات کی تفصیل بہت طویل ہے۔ حکومت نے علوم جدیدہ اور مغربی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک طبی کالج، ایک درسگاہ صنائع نفیسہ اور حربی دارالعلوم قائم کر رکھا ہے۔ کابل کی انجمن ادبی، مجلس اصلاح ترقی عسکری اور ملک کے متعدد رسائل و جرائد نے جنکو بڑی محنت اور کامیابی سے مرتب کیا جاتا ہے تہذیب و شائستگی کی نشر و اشاعت میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ رفاہ عامہ کے لئے عام تعمیرات اور ادارات کے علاوہ سل و دق کی ایک صحت گاہ، دارالیتامی اور پاگل خانہ، دواخانے، اسپتال، دائیوں اور نرسوں اور کمپونڈروں کے لئے متعدد مکاتیب قائم کر دئے گئے ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر قابل ذکر امر یہ ہے کہ مغربیت کی وہ کورانہ تقلید جو عہد امانی میں عام تھی حفظ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ سے بدل گئی ہے۔ غیور افغانوں میں خدمت اسلامی کا ایک سچا ولولہ موجود ہے اور امید ہے کہ جمعیۃ العلما کی تاسیس شرائع اسلامی کی تجدید اور فروغ و اشاعت کے لئے خاص طور سے مفید ثابت ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ افغانستان کے ذرائع محدود ہیں اور ہمیں اس کی قوت و طاقت اور اصلاح و ترقی کے متعلق نہ بخل سے کام لینا چاہیئے نہ مبالغے سے لیکن حکومت افغانستان کے موجودہ طرز عمل نے اس عظیم الشان اسلامی سرزمین کے لئے ایک نہ بردست مستقبل کا سنگ بنیاد رکھ دیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آزادی و استقلال کا وہ جشن جو ہر سال چمن حضوری میں منایا جاتا ہے۔ افغانستان کی قوت و سطوت کا حقیقی مظہر ثابت ہوا کریگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

سیاحتِ اندلس

جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے۔ ناظم محکمۂ آثارِ قدیمہ دولتِ آصفیہ حیدرآباد

مجریط

پروگرام کے مطابق مجھے سرقسطہ میں دو روز ٹھہرنا تھا۔ یہ آنکھ میچتے گزر گئے۔ اور آخر بارہویں دسمبر کو Continental Express سے میں مجریط پہنچ گیا۔ کرسمس کا قرب تھا۔ شہر دلہن بنا ہوا تھا۔ شام کو سیلانیوں کا یہ زور ہوتا تھا کہ بڑے بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اور قہوہ خانوں میں جگہ ملنے کے لئے بڑی بڑی دیر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ تھیٹروں میں تو نشست کا انتظام اگر دنوں پہلے سے نہ کیا جاتا تو داخلہ ناممکن تھا۔ مجریط والے سیر زانشش، لباس اور اچھے کھانے کے شوقین، دل کے صاف لیکن ہمت کے ذرا ہیٹے۔ طبیعت میں عام طور سے قدامت پسندی کی بو، سڑکوں پر ریلے گیلے پھرتے تھے۔ ہسپانیہ والوں کی بعض عادات ایشیائی امرا سے بہت ملتی ہیں۔ شام کا کھانا دس ساڑھے دس بجے کھاتے ہیں۔ اور تھیٹروں میں گیارہ بجے کے قریب جاتے ہیں۔ میں پہلی مرتبہ ساڑھے نو بجے کے قریب گیا۔ تو بالکل سناٹا پایا۔ انگلستان کے تقریباً تمام تماشا گاہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بند ہو جاتے ہیں۔ تاکہ آیندہ دن کے کاروبار پر کچھ اثر نہ پڑے۔ ہسپانیہ کے تھیٹر دو ڈھائی بجے کے قریب بند ہوتے ہیں۔ لوگوں کو سونے سلانے میں تین بجے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ عموماً ۹ بجے کے قریب کھاتے ہیں۔ دوپہر کے قیلولے کا بھی عام رواج ہے۔ دو تین گھنٹے تمام دوکانیں اور کاروبار بند رہتے ہیں۔ غریب بھی اپنے Seista تیلولے کو ناغا نہیں کرتا۔ اس وقت باغوں، خیابانوں، خیموں میں خوب لے دلق ہو جاتی ہے۔ لوگ جا بجا گھاس کے تختوں پر لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہسپانیہ میں پولیس کی بھی کثرت ہے۔ لندن جیسی بے لاگ، غیور، دلیر اور نفع رساں پولیس کہیں نظر نہیں آتی۔ فوج والوں کی وردیاں نہایت شاندار ہیں۔ اور رات دن وہی پہنے رہتے ہیں۔ سڑکوں پر، بڑی بڑی دکانوں میں، ریل میں، قہوہ خانوں میں، تھیٹروں میں، جہاں دیکھو یہ زرق برق ملبوس والے موجود

بہار میں لندن کی تصویری دنیا میں اشبیلیہ کی ایک قاعدہ کے حسن کا بڑا چرچا رہا۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کے فوٹو The most beautiful woman of the world دنیا کی سب میں خوبصورت عورت کے عنوان سے Illustrated London News & Graphic میں شائع ہوئے۔ بعض آپ کی نگاہ سے بھی گذرے ہونگے۔ انصاف سے پوچھیئے تو ہسپانیہ میں ایسی خوبصورت عورتیں سینکڑوں موجود ہیں۔

مجریط نیا شہر ہے دسویں صدی سے قبل اس کا پتہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ مسلمانوں کے زمانہ کا یہاں ایک قلعہ تھا جس کا موقع اسی جگہ بیان کیا جاتا ہے جہاں اب قصر شاہی ہے۔ فلپ ثانی نے ۱۵۶۰ء میں شہر کو پایۂ تخت مقرر کر دیا۔ عمارتیں سب نئی ہیں۔ صرف سینٹ پطرس کا گرجا چودہویں صدی کی تعمیر ہے۔ اس کی ساخت میں اسلامی اثر موجود ہے۔ باقی گرجا تیرہویں صدی یا بعد کے بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں کشادہ اور وسیع ہیں۔ اور جابجا چمن اور خیابان ہیں۔ سواری کا انتظام معقول ہے۔ بجلی کے ذریعہ سے ٹریم چلتی ہے۔ اور زیر زمین ریل بھی موجود ہے۔ بعض لوگ مجریط کو پیرس کی نقل کہتے ہیں۔ شہر کے بڑے چوکوں میں Puerta de Sol باب الشمس خصوصیات سے قابل ذکر ہے۔ یہاں جیسا کہ نام سے معلوم ہوتا ہے کسی زمانہ میں شہر پناہ کا دروازہ تھا لیکن اب ایک ہی چوک رہ گیا ہے اور دروازہ شہر کی توسیع میں منہدم کر دیا گیا۔ اس مقام کو لندن کا پکیڈلی سمجھنا چاہیئے۔ تمام سڑکیں یہاں آکر ملتی ہیں اور شام کو شوقین اور صاحبِ ذوق مرد اور عورتوں کا یہاں بے انتہا اژدہام ہوتا ہے۔ اس چوک کے علاوہ Buen Retiro اور Paseo de la Catellana کی روشوں اور چمنوں میں بھی مجریط کے بانکوں اور رسیاؤں کا ہجوم رہتا ہے۔ سڑکوں میں سب سے وسیع القلعۃ Alcala ہے۔ یہ پیرس کی سڑکوں کی وضع پر بنائی گئی ہے اور شہر کی تمام مشہور عمارتیں اس کے گرد و جانب میں واقع ہیں۔ مجریط کی نئی عمارتوں میں مجھے الفونسو دوازدہم کی یادگار بہت پسند آئی۔ یہ ایک وسیع باغ میں واقع ہے۔ اور تالاب کے کنارے مخلوط یونانی وضع میں بنائی گئی ہے۔ عمارت میں سر سے پیر تک نہایت شفاف سنگ مرمر لگایا گیا ہے۔ جس کی صفائی اور جلا اور لب آب کا لطیف منظر اہل ذوق کے لیے دل کشی سے خالی نہیں

برطانوی محکمہ خارجہ کی عنایت کی وجہ سے مجھے ہر ملک میں بے انتہا سہولت میسر آئی۔ میرا ہسپانیہ کے متعلق پروگرام پہلے ہی سے سفارت خانہ کو بھیج دیا گیا تھا۔ سفیر صاحب اس زمانہ میں مجریط میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان کے نائب مسٹر چارلس ویکفیلڈ نے جو مختار کل کہلاتے ہیں* مجھے بہت مدد دی۔ علمی جماعتوں کے نام

* Charge de Affair

ممتاز اشخاص سے میرا تعارف کرایا۔ بعض کے نام سفارشی خطوط اور کارڈ دیئے۔ بعض کے پاس خود ملانے کو لے گئے۔ ان عنایات کی وجہ سے مجھے مجریط کی مشہور درسگاہوں اور عجائب خانوں کی سیر کرنے کے علاوہ بعض اہلِ ذوق کے خانگی ذخائر کے دیکھنے کا بھی موقع نصیب ہو گیا۔

مجریط کے عجائب خانوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے میں Prado کا ذکر کرونگا۔ یہ اہلِ فن کے نزدیک ان تصاویر کے لحاظ سے جو وہاں موجود ہیں دنیا کے سب عجائب خانوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ٹشین Titian رفائیل Raphael تینٹوریٹو Tentorzitto ویلاسک Velasque موریلو Murillo ربیرا Ribera وان ڈائک Van Dyack روبن Ruben اور ٹینیرز* کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے ہیں یہ اہلِ کمال نقاشی کی دنیا میں دیوتاؤں کا رتبہ رکھتے ہیں۔ لیکن متحف پراڈو کی خصوصیت اور شہرت زیادہ تر نقاشانِ ہسپانیہ کی وجہ سے ہے جن میں ویلسکت کا رتبہ ممتاز ہے۔ یہ نقاش سولھویں صدی کے آخر میں اشبیلیہ میں پیدا ہوا اور ۱۶۶۰ء تک زندہ رہا۔ ہسپانیہ کے مخصوص طرز نقاشی کو اس نے آسمان پر پہنچا دیا۔ متحف پراڈو میں ویلسکت کی مشہور تصویر Las Meninas آویزاں ہے جسکو اکثر نقادانِ فن اور اربابِ ذوق دنیا کی تصاویر میں سب میں بہتر خیال کرتے ہیں۔

ہسپانیہ کی نقاشی میں ایک خاص خشکی اور سنجیدگی موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فن اس قلمرو میں مذہب کے آغوش میں پلا۔ تصاویر کا مقصد بزرگوں کے کارنامے دکھانا اور تلقینِ دین تھا۔ حسن اور ولولہ سے اسے سروکار نہ تھا چنانچہ El Greco اور اس کے بعض مقلدین کے مرقع دیکھ کر بجائے فرحت کے وحشت ہونے لگتی ہے۔ سترہویں صدی میں اطالیہ کے فن کا ہسپانیہ میں ضرور اثر ہوا۔ لیکن پھر بھی یہاں کے اہلِ کمال نے اپنے مخصوص رنگ کو قائم رکھا ہے۔ زربارن Zurbaran اور مریلو Murillo کی تصویریں اس خیال کی شاہد ہیں۔ مجھے ہسپانیہ کے تمام نقاشوں میں مریلو کی نقاشی بے حد پسند آئی۔ اندلس کا آسمان پہاڑ اور سبزہ کا رنگ ہوا کی سرسراہٹ کاشتکاروں اور کم استطاعت لوگوں کی بسیط زندگی سب موجود ہے۔ تصویریں گو مذہبی ہیں لیکن غور سے دیکھو تو بیوی مریم کی تمام تصویروں میں اندلس کی دیہاتنیں کھڑی نظر آتی ہیں یہی حال مختلف شیبوں کے مرقعوں کا ہے جن میں وہی آدمی نظر آتے ہیں۔ جو اشبیلیہ کے بازاروں میں روزمرہ چلتے پھرتے ہیں۔ مریلو کی تقریباً چالیس تصویریں پراڈو میں موجود ہیں۔ میں اس متحف میں تین روز تک برابر گیا اور کئی کئی گھنٹے روز صرف کئے۔ اور پھر بھی تصویروں کے دیکھنے سے نیت سیر نہ ہوئی۔ دیوانوں کی طرح ایک کمرے سے دوسرے

* Teniers

کمرے میں پھرتا تھا جب تھک جاتا تھا تو بیٹھے بیٹھے تصویروں کو تکتا تھا حقیقت میں یہ ایک ایسی ضیافت تھی کہ جس کے بوقلموں کھانوں کی چاشنی روز مرہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

متحف پراڈو کے علاوہ مجریط میں فن نقاشی کے لئے ایک اور عجائب خانہ بھی ہے جس میں موجودہ طرز کی تصاویر کا مجموعہ ہے اپنی وضع کے یہ اچھے نمونے ہیں لیکن جو تخیلات تصویروں میں نمایاں ہیں ان سے عجب اضطراب کشاکش اور وحشت پائی جاتی ہے۔ رنگوں کی آمیزش، چہروں کے خد و خال آنکھوں کے تیور کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی ترکیب لباس کی تراش خراش۔ سب میں رسمیات کی بیڑیوں کو توڑنے اور ایک نیا رنگ جمانے کی کوشش موجود ہے اس میں شک نہیں کہ پرانا جامہ تنگ ہو گیا تھا۔ اور اس میں جدت کی سنجافیں اور حاشیے بدزیب معلوم ہوتے تھے۔ لیکن پرانے جامہ کو دیوانہ وار تار تار کر کے درختوں کے پتے لپیٹ لینا خبر نہیں کہاں تک درست ہے۔ وحشت کا یہ میلان صرف نقاشی کی قلمرو تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ یورپ کے اس سفر میں میں نے یہ اثر عالمگیر پایا۔ خواہ تھیٹر ہو خواہ بائیسکوپ۔ خواہ ڈرامہ خواہ ناول خواہ نیم برہنہ پوشاکیں خواہ کترواں پٹھے یا جھاڑ جھنکاڑ بال سب میں وحشیانہ کشاکش موجود ہے۔[1]

جس عمارت میں موجودہ طرز کی تصاویر کا مجموعہ ہے اسی میں شاہی کتب خانہ اور آثار قدیمہ کا متحف بھی ہے یہ نہایت شاندار عمارت ہے۔ کتب خانہ نیچے کی منزل میں ہے۔ کتابوں کی ٹھیک تعداد مجھے یاد نہیں رہی۔ لیکن ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ قومی رنگ قائم رکھنے کیلئے دو کمرے صرف Cervantes کے لئے مخصوص ہیں۔ اس مشہور مصنف کی زندگی کے واقعات اور Don Quixote کے بعض قصے تصویروں کے ذریعہ سے دکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کی مختلف اشاعتوں میں سے (۴۸۶) اس کتاب خانہ میں موجود ہیں۔ آثار قدیمہ کا ذخیرہ بھی نہایت عظیم الشان ہے تقسیم اور ترتیب میں متحف برطانیہ اور لوور Louvre کا تتبع کیا گیا ہے حجری زمانہ کے اوزار، برتن اور مرتبان نما تابوت نہایت دلچسپ ہیں۔ رومانوی ستونوں مجسموں اور برنجی اشیاء کا ذخیرہ بھی معقول ہے۔ یہی حال مصری اور یونانی آثار کا ہے۔ پرانی چینی کا بھی مجموعہ نہایت نفیس ہے۔ بعض برتن جن پر عربی وضع کے نقوش اور کتابے ہیں مجھے بہت پسند آئے۔ قدیم کپڑوں کے نمونے بھی موجود ہیں لیکن یہ سب عیسوی زمانہ کے ہیں۔ عربی طرز کے فن تعمیر کی نمائش کے لئے ایک خاص حصہ ہے جس میں غرناطہ اور قرطبہ

---

[1] میرا یہ سفر ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ اب یہ اثر ایسا عالمگیر ہوا ہے کہ ہندوستان اور مشرقی ممالک بھی اس سے نہ بچ سکے۔

کی عمارات کے نمونے سجائے گئے ہیں۔ پردوں Tapestries کا مجموعہ بھی بہت اچھا ہے۔ یہ
زیادہ تر برسلز کی بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کے نقش ونگار میں مذہبی حکایات اور قصص بیان کئے گئے ہیں۔ ہسپانیہ کا ایک
زمانہ میں چونکہ امریکہ پر بھی قبضہ تھا اس لئے میکسیکو اور پیرو کی اشیا کا بھی اچھا ذخیرہ ہے۔ بعض مرتبانوں پر گنڈابیرنڈا
کی تصویر دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی۔ یہ ایک خیالی جانور ہے۔ عقاب کی سی وضع ہے۔ دو سر ہیں۔ چونچوں میں ہاتھی
لئے ہوئے ہے۔ وجیانگر کے سونے کے سکے جو راجہ اچیتارائے کے زمانہ کے ہیں۔ ان کے ایک جانب اس جانور کی تصویر
نقش ہے۔ قدیم یونانی اشیا پر بھی اسی قسم کے دو سر کے عقاب کی تصویر پائی جاتی ہے۔ میکسیکو اور پیرو کے قدیم آثار
میں میں نے ایک پتھر بھی دیکھا جس پر آسمانی بروج کی نسبت سے سال کی تقسیم دکھائی گئی ہے۔

مجریط کے امرا کو بھی قدیم اشیا کے جمع کرنے کا بڑا شوق ہے چنانچہ اسمانامی ایک امیر کے ذخیرہ کو دیکھنے کا اتفاق
ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے زمانہ کے بعد کا چینی کا ذخیرہ نہایت نفیس ہے۔ گو حکومت عیسائی تھی اور دین اسلام
ظاہرا ہسپانیہ سے جا چکا تھا۔ لیکن صنعت میں اسلامی اثر نمایاں ہے۔ اکثر رکابیاں بلنسیہ کی بنی ہوئی ہیں۔ اس ذخیرہ
میں چینی کے علاوہ قدیم کپڑوں اور سکوں کا بھی اچھا مجموعہ ہے۔ کوفی خط کے کتبے بھی ہیں جو چھٹی صدی ہجری کے ہیں۔
علمی درسگاہوں میں سب سے افضل مرتبہ Academy کا ہے۔ یہ ۱۷۱۳ء میں ہسپانوی زبان کی اصلاح
اور ترقی کے لئے قائم ہوئی تھی۔ تاریخی تحقیق کی مجلس Centro de Estudios Historicos
بھی نہایت عظیم الشان ہے۔ گذشتہ ۳۰ سال میں اس مجلس نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ تقریباً ۳۰۰ کتابیں شائع
ہو چکی ہیں۔ جو تحقیق اور علمی تجربہ کے لحاظ سے انگلیسی، المانی اور فرانسیسی مؤلفات سے ہرگز کم نہیں۔ اس مجلس کے مختلف
شعبے ہیں۔ عربی علوم کی تحقیقات استاد آسین اور استاد ریبرا کی نگرانی میں انجام پاتی ہے۔ ابن الابار کا تکملہ اور
کتاب القضاۃ بقرطبہ جو ان اساتذہ کے زیر ادارت شائع ہوئی ہیں تحقیق اور لیاقت کا اچھا نمونہ ہیں۔ استاد ویلسکث
اور استاد مورینو آثار قدیمہ کے شعبوں کے مدیر ہیں۔ اسلامی فن عمارت پر بھی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن
اب تک کوئی جامع تالیف مرتب نہیں ہوئی۔ اسلامی کتبوں پر بھی اب تک کافی توجہ نہیں ہوئی۔ کپڑوں اور چینی پر چند مؤلفات
زیر ترتیب ہیں۔ میں نے ان کی تصویریں دیکھیں۔ حجری اور ماقبل تاریخ زمانہ کے آثار کی اچھی تحقیق ہو چکی ہے۔ اور بہت سی
عمدہ کتابیں تالیف ہو چکی ہیں۔ تیس برس قبل ہسپانیہ میں علمی تحقیقات کا مطلق انتظام نہ تھا۔ المانی اور فرانسیسی علما
چھائے ہوئے تھے۔ یکایک حکومت کو خیال پیدا ہوا اور انھوں نے ہونہار اور لائق طالب علموں کو کثرت سے یورپ
کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھیجنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس برس کے اندر علوم و فنون کے سب شعبوں کے لئے

ملک میں مجلسیں قائم ہوگئی ہیں۔ اور اب استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ تحقیقات میں مصروف ہیں۔ اور نہایت مفید کام کر رہے ہیں۔

مجریط کے دار العلوم میں تقریباً چھ ہزار طالب علم علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں درس حاصل کرتے ہیں۔ زراعت فن تعمیر معدنیات ڈاکٹری اور فنون لطیفہ کے لئے علیحدہ تعلیم گاہیں ہیں۔ عورتوں کی تعلیمی حالت انگلستان فرانس اور المانیہ کی نسبت بہت پست ہے جس کا بڑا سبب مذہب ہے * تاہم مجریط میں لڑکیوں کے لئے علاوہ ابتدائی مدارس کے اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں موجود ہیں۔ اور ایک کالج استانیوں کی تعلیم کے لئے بھی ہے۔

ایسکوریل

مجریط کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے ایک ہفتہ بھی کافی نہیں۔ گو امریکہ کاسیلانی دو ہی دن کے قیام بعد چار سو صفحے کی کتاب لکھ دیتا ہے۔ اور اہل ملک اس کی رائے اور مشاہدہ کی وقعت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں افسوس ہے کہ اب تک نہ یہ سرعت تخیل پیدا ہوئی اور نہ کتاب لویس کا ملکہ۔ اس لئے جہاں کہیں اس سیاست میں میرا اور امریکہ والوں کا اتفاق سے ساتھ ہوگیا میں ہمیشہ پیچھے رہا۔ اور وہ بازی لے گئے۔ گو اپنی طرف سے میں نے بھی قدم بہت تیز رکھا مجریط سے سات دن ختم ہوتے ہی میں ایسکوریل روانہ ہوگیا۔

یہ مقام مجریط کے شمال مغرب میں (۲۳) میل کے فاصلہ پر جبل الرل کے دامن میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ میں جب گیا تو خوب سردی تھی آب و ہوا خشک ہونے کی وجہ سے ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اور منظر نہایت دلفریب تھا۔ یہاں کی خانقاہ کی جس میں شاہی محلات مقابر لنیسہ مدرسے سب کچھ شامل ہیں۔ میں بہت تعریف سن چکا تھا۔ اور دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا۔ بعض اور روپی مولفین نے خانقاہ کی تعریف میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اس کو دنیا کے عجائبات میں آٹھواں شمار کیا۔ مجھے افسوس ہے۔ اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ عمارت خاکستری رنگ کے سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے چھتیں سلیٹ کے پتھر یا جست کی چادروں کی ہیں۔ بیچ کا گنبد البتہ ذرا وقعت رکھتا ہے لیکن عمارت کی روکار سے کوئی خاص شان یا دل کشی کی ادا نہیں ٹپکتی۔ بلکہ کسی قلعہ یا محبس کی چار دیواری معلوم ہوتی ہے۔

---

* نئے انقلاب نے مذہب کو فنا کر دیا

اس عمارت پر چھ لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ یعنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ شاہجہان نے دلی کے لال قلعہ پر دو کروڑ خرچ کیے تھے۔ لیکن وہ لال پڑی ہے۔ اور یہ اس کے سامنے حبشی لونڈی۔ خانقاہ کو فلپ ثانی نے منت کے طور پر تیار کرایا تھا۔ بیس برس میں بن کر تیار ہوئی۔ عمارت کا ابتدائی نقشہ تولیدو نامی معمار نے تیار کیا تھا لیکن وہ ایسا عظیم الشان تھا کہ بادشاہ کو ڈر ہوا۔ عمارت اس کی زندگی میں تیار نہ ہو سکیگی۔ چنانچہ نقشہ میں بادشاہ نے بہت کچھ تغیر و تبدل کیا۔ تولیدو عمارت کے بنتے بنتے مرگیا اور اس کی جگہ ہیرارا نامی ایک اور معمار مقرر ہوا۔ خدا کی شان دیکھئے فلپ بھی دوران تعمیر میں ایک دفعہ ایسا بیمار ہوا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے لیکن پھر اللہ نے شفا دی اور وہ عمارت کی تکمیل کے بعد چودہ برس تک اس میں مقیم رہا۔ اور جب مرا تو وہ اسی تاریخ اور اسی مہینے میں مرا جس میں خانقاہ بن کر تیار ہوئی تھی۔ خانقاہ کا دور باہر سے ایک ہزار گز ہے۔ لیکن اندر مکانات اور کنیساؤں کی ایسی بھول بھلیاں ہے۔ کہ بغیر نقشہ کے عمارت کی ترتیب سمجھنی مشکل ہے۔ میں نے تین دن تک عمارت کی سیر کی لیکن یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہر چپہ کو دیکھ لیا۔ خانقاہ کے پندرہ صحن رہبانوں کے لئے مخصوص تھے اور سولہ عام زائرین اور بادشاہ کے خدم و حشم کے لئے چالیس ٹیجے Altars اٹھاسی حوض چھیاسی زینے۔ بارہ سو دروازے۔ اور (۲۶۷۳) کھڑکیاں اب بھی موجود ہیں۔ اگر مختلف برآمدوں اور راستوں کے طول کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ تو ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہو جاتا ہے۔ عمارت کی تزئین اور آرائش میں بادشاہ کے شوق نے نئی اور پرانی دنیا کے کسی ملک کی قیمتی معدنیات کو باقی نہ رکھا تھا۔ علاوہ ازیں پردوں، تصاویر اور نقوش سے ایسا سجایا تھا۔ کہ عمارت نگارخانہ چین بن گئی تھی۔ شاہجہان نے دہلی کے ایوان خاص کے حسن سے محو ہو کر یہ بیت بطور کتابے کے لکھوا دی تھی۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ؎ ہمین است وہمین است وہمین است

محویت اور لن ترانی کے اسی جذبہ نے شاہان ہسپانیہ سے یہ کتابہ لکھوایا :-

"ایسکوریل کی سی شان وشکوہ کا مقبرہ دنیا کے کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہے۔ اس
فوقیت کا سہرا ہمیشہ ہسپانیہ ہی کے سر رہیگا۔ عمارت کا خیال چارلس پنجم کو پیدا ہوا۔ فلپ
ثانی نے اس کو بنایا"

یہ عبارت بھی کتاب خانہ کی دیوار پر ایک سونے کی تختی پر کندہ ہے۔ "ایسکوریل کا بانی مفلس نہیں مرا" بادشاہ نامہ میں جب ہم شاہجہان کے خزانوں کی فہرست دیکھتے ہیں۔ اور اس زر و جواہر کا خیال کرتے ہیں۔ جو اس نے تاج محل اور دہلی کی عمارات پر صرف کئے۔ تو فلپ کی تعلّی نہایت حقیر معلوم ہوتی ہے۔

عمارت کے صدر دروازہ میں سے داخل ہونے کے بعد ہم ایک بڑے صحن میں پہنچتے ہیں اس کے دونوں جانب سادی وضع کی پنج منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں جن سے صحن کی وسعت اور شان کا صحیح طور سے اندازہ نہیں ہو سکتا صحن کے دائیں جانب بالائی منزل میں کتب خانہ ہے اور بائیں جانب فلسفہ اور الٰہیات کی قدیم درسگاہوں کے ایوان ہیں دروازہ کے مقابل میں گرجا کی عمارت ہے۔ اس کی خوبی اور شوکت میں کچھ شک نہیں اور یہ اندرونی عمارت میں سب سے بہتر ہے۔ گرجا کا طول (۳۴۰) فٹ اور عرض (۲۰۰) فٹ۔ عمارت کی اندرونی وضع نہایت بسیط اور سادہ ہے اور Doric طرز کا تتبع کیا گیا ہے چھت کی تصاویر اور منبر اور مذبح کی مرصع کاری نے عمارت کی متانت میں ضرور بے عنوانی پیدا کر دی ہے۔

مذبح کے عین نیچے شاہی قبور کا حجرہ ہے۔ اس کی وضع ہشت پہل ہے اور دیواروں اور فرش میں سنگ برنگ کے پتھروں کی پچیکاری ہے۔ حجرے کے پہلوؤں میں بیس طاق بنائے گئے ہیں جن میں سیاہ سنگ مرمر کے تابوت رکھے ہیں۔ ان میں ہسپانیہ کے بادشاہوں اور بیگمات کی خاک محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ شاہزادوں اور شاہی خاندان کے اراکین کے لئے بھی حجرے ہیں۔ عمارت کے اس حصہ کی آرائش آخری زمانہ کے اطالوی طرز کی ہے۔ گرجا اور شاہی قصر کے بیچ میں بانی خانقاہ کے رہنے کے حجرے ہیں۔ ان کا ساز و سامان بہت سادہ ہے۔ پڑھنے کے کمرے میں ایک بید ستی کرسی ہے جس کی نسبت یہ روایت ہے کہ فلپ اسی کرسی پر اپنی ٹانگ جس پر گٹھیا کا اثر تھا پھیلایا کرتا تھا۔ سونے کے کمرے میں دو کھڑکیاں ہیں جن میں سے بادشاہ بڑے مذبح کی زیارت کر سکتا تھا۔ ایک دربہت مختصر حجرہ ہے۔ جہاں اس نے وفات پائی یہاں ہسپانوی زبان میں ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

محل میں بادشاہی جاہ و حشم کے سب سامان موجود ہیں۔ بیسیوں ایوان ہیں جن کی دیواریں لاجواب تصاویر اور پردوں Tapestries سے آراستہ ہیں۔ پردوں کے نقوش کے بعض نمونے روبین تینیرز اور گویا کے قلم کے ہیں۔ ویلسکٹ کی تصاویر کا مجموعہ بھی نہایت نفیس ہے۔ چھتوں پر بھی نقش کاری کی گئی ہے چھتوں کی تصاویر میں بہترین اس زینہ کی سقف میں ہیں۔ جہاں سے ایوانوں کے حجروں کو راستہ جاتا ہے ایک کمرے میں صرف لڑائیوں کے منظر دکھائے گئے ہیں۔ وہ لڑائی جس میں مسلمانوں کو غرناطہ کے قریب شکست ہوئی سب میں زیادہ نمایاں ہے۔ میرے دل پر اس کو دیکھ کر ایک چوٹ سی لگی۔

خانقاہ کی عمارتوں میں سے اب صرف کتب خانہ کا اور ذکر کروں گا۔ اس کی ترتیب اور سجاوٹ Vatican پاپائی اعظم کے کتب خانہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ایک زمانہ میں اس کا شمار یورپ کے بہترین کتب خانوں میں تھا۔ لیکن

اب وہ بات نہیں رہی تین ہزار عربی قلمی نسخے ہیں اور کوئی بیس ہزار دوسری زبانوں کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں عربی کتابوں میں سے بعض مولی زیدان (۱۹۰۳-۱۸۶۸ء) والی مراکش کے کتب خانہ کی بھی ہیں۔ موسیو کیسری M. Casiri نے عربی نسخوں کی ایک شرح فہرست ۱۷۶۰ء میں تیار کی تھی۔ یہ اب پرانی ہوگئی ہے۔ جو کتابیں میں نے نکلوائیں وہ سب دوسری نکلیں۔ خود ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کی تاریخ پر یہاں اچھا مجموعہ ہے۔ طب، ریاضیات، نجوم، تفسیر فقہ، حدیث پر بھی کثرت سے کتابیں ہیں۔ خطاطی کے لحاظ سے بعض قرآن شریف بھی لاجواب ہیں۔ خط کی شان اکثر کتابوں میں مغربی ہے۔ اس کتب خانہ میں مجھے ایک نقشوں کا مجموعہ بھی دیکھنے میں آیا جس میں سولہویں صدی تک دنیا کے حالات جسطرح معلوم تھے۔ درج ہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار مولوی عنایت اللہ یاد آگئے۔ شاید میں نے ان کو وہاں سے خط بھی لکھا تھا۔

ایسکوریل میں خانقاہ کے علاوہ فلپ ثانی کی بیٹی کا لگایا ہوا ایک باغ ہے جو نہایت پرفضا ہے۔ اس باغ میں ایک مختصر سی عمارت ہے جس کے مختلف حجروں میں ہاتھی دانت، چاندی اور سونے کی مرصع کاری اور سینے کے کام کی چھوٹی چھوٹی چیزیں سجی ہوئی ہیں۔ پردوں اور زردوزی کے کام کا بھی مجموعہ نفیس ہے۔ تصاویر بھی ہیں چھتوں پر جو مرقعے ہیں۔ وہ Pompeii کے تصاویر کے رنگ میں ہیں۔ اس عمارت کی چھتیں بہت نیچی ہیں جس سے تماشائی کا دم اندر جانے سے کچھ گھٹنے لگتا ہے۔

ضربِ کلیم پر ایک طائرانہ نظر

بقلم

فقیر یوسف سلیم چشتی بریلوی

علامہ اقبال نے بال جبریل میں ایک مقام پر لکھا ہے ۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا عہدِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

میں نے اس شعر کو حسبِ معمول بار بار پڑھا، "دانشِ حاضر" اور "چوبِ کلیم" دونوں کی مناسبت پر غور کیا، اور خدا سے دعا کی کہ یا الٰہی! کسی مردِ خود آگاہ کو یہ چوب عنایت کر تاکہ مسلمانوں کا قافلہ اس کی رہنمائی میں منزلِ مقصود تک پہنچ سکے ۔

شکر ہے کہ فقیر کی دعا قبول ہوئی، اللہ نے اپنے ایک مقبولِ بارگاہ بندہ کو، جس کا طریق امیری نہیں بلکہ فقیری ہے، یہ دولت ارزانی فرمائی اور 'ضربِ کلیم' منصۂ شہود پر آئی ۔

یہ کتاب جو علامہ موصوف کے تازہ ترین افکارِ عالیہ کا آئینہ ہے ۔ اسی ماہ میں شائع ہوئی ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اولیں فرصت میں اس کا مطالعہ کر کے، اپنے لئے سرمایۂ حیات بہم پہنچائیں ۔

یہ کتاب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے اس سے دو چند ضخامت کی کتاب درکار ہے ۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ باطل کا مقابلہ کرنے، طلسمِ مغرب کو پاش پاش کرنے، اور مسلمانوں کو درسِ حیات دینے کے لئے، کتابوں کی پچاس الماریاں ایک طرف اور یہ کتاب ایک طرف ۔

یوں تو علامہ کی ہر کتاب، بلکہ اس کی ہر سطر میرے لئے نوید جاوید لاتی ہے لیکن اس کتاب کو پڑھ کر مجھے ایک خاص مسرت ہوئی اس لئے کہ علامہ نے اس کتاب میں اپنی شخصیت اپنے افکار اپنے فلسفہ اور اپنے پیغام سب چیزوں کو اس قدر نمایاں اور واضح کر دیا ہے کہ اب کوئی مسلمان، جو حیات کا طالب ہے، یہ عذر پیش

نہیں کر سکتا کہ مدراس لیکچرز انگریزی میں ہیں اور زبور عجم فارسی میں ہے۔ پہلی زبان پر دسترس نہیں اور دوسری کو قصداً نہیں پڑھا۔ پیغام کو سمجھوں تو کس طرح؟ اب صرف وہی مسلمان اس آب حیات سے محروم رہیں گے جو انہیں "پنجابی شاعر" سمجھ کر اُن کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے یا وہ جو اس حسد کی وجہ سے، ان کی خوبیاں نہیں دیکھ سکتے کہ ہم اقبال کیوں نہ ہوئے۔

اقبال سے آگاہ ہونا آسان بات نہیں۔ خود اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے لئے علمی لیاقت ذوقِ سلیم اور نظرِ غائر اور سب سے بڑھ کر سنجیدہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

[دیدہ ور کو دیکھنے کے لئے بھی تو دیدۂ بینا درکار ہے]

مجھے کس قدر افسوس ہوتا ہے جب میں اپنی مردہ قوم کے بظاہر زندہ افراد کو علامہ کے فلسفہ پر بے سر و پا تنقید کرتے دیکھتا ہوں۔ خدا کی شان نظر آتی ہے کہ وہ لوگ جو علامہ کی فلسفیانہ مثنوی گلشن راز جدید کے اشعار کا اردو میں ترجمہ نہیں کر سکتے وہ ان کی شاعری اور اُن کے فلسفہ پر بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے ہیں۔

مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ میں علامہ موصوف رقمطراز ہیں:۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:۔

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

بال جبریل میں اور بھی واضح کر دیا ہے:۔

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلۂ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

ان تصریحات و تلمیحات سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ علامہ کی شاعری، ان کے لئے مقصود بالذات نہیں۔

بلکہ مقصود بالعرض ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنے کہ انہوں نے شاعری کو ، اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا ہے ان کا مقصد حیات شاعری نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا ہے *

خدا غریقِ رحمت کرے ۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری مرحوم نے آج سے ۱۷ سال پہلے کہا تھا " اقبال ' شاعر نہیں ہے، بلکہ مسیحا ہے جو چودھویں صدی کے مردہ مسلمانوں کو زندہ کرنے کے لئے آیا ہے ۔"

لہٰذا میں، علامہ کے تمام نقادوں کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ علامہ کے پیغام کو غور سے پڑھیں اور یہ دیکھیں کہ وہ پیغام مسلمانوں کے لئے نویدِ حیات ہے یا نہیں ؛ رموز و حقائق حیات کی جو روح افروز تشریح انہوں نے کی ہے وہ صحیح ہے یا غلط ؛ مسلمانوں کو ترقی کا جو نسخہ انہوں نے بنایا ہے وہ تیر بہدف ہے یا نہیں ؛ " ساحر الموط " نے جو برگ حشیش " مشرقی غلاموں کو پلایا ہے اس کے نشہ کا اتار ، ان کے کلام بلاغت نظام میں موجود ہے یا نہیں ؛ علامہ نے یہ کہہ کر مسلمانوں کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا ہے :۔

گر تو مے خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز اندر آیاتش یکے خود را بہ سوز

ان کا یہ قول درست ہے یا نہیں ؛

---

* کیا داغ اور امیر ناسخ اور آتش کے یہاں اس قسم کے شعر مل سکتے ہیں ؛

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے ؛ فقط جوہرِ خودی کی نمود کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

(ضرب کلیم)

اگر نہیں مل سکتے تو پھر آپ اقبال کو ، ان لوگوں کی صف میں کیوں شامل کرتے ہیں ۔ اگر اقبال کا کلام یا اس کے کلام کا رنگ نصیر اور ذوق ، سودا اور میر سے جدا ہے ۔ تو اقبال کا مقام بھی ان بزرگوں سے ضرور جدا ہوگا کاش مسلمان اور خصوصاً یو پی کے مسلمان یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ اقبال کا دعویٰ کیا ہے ؛ وہ تو یہ کہتے ہیں :۔

مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش سرّے از اسرارِ قرآں گفتمش
عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو کہ میرے شعلہ میں ہے سرکشی و بے باکی
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

انہوں نے مسلمانوں کو تقلید مغرب کے خوفناک نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ ان کا یہ درس حکمت، درست اور مناسب ہے یا نہیں۔

مضمون کے اس حصہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ نوجوانوں کو دینا چاہتا ہوں اور اگر یہ مجھے تسلیم ہے کہ میں واعظ یا مفتی نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ گزشتہ بارہ سال سے علامہ کے کلام کا مطالعہ کر رہا ہوں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس مشورہ دہی کا مجھے حق حاصل ہے۔

اگر "بانغ نظر نقادانِ فن" علامہ کے کلام پر تنقید کے ایسے ہی خواہشمند ہیں تو انہیں چاہئے کہ

(۱) سب سے پہلے فارسی زبان میں دسترس حاصل کریں۔

(۲) اس کے بعد انگریزی زبان پر عبور حاصل کریں۔

(۳) اسلامی تاریخ، کلچر، اور علم کلام سے آگاہی حاصل کریں۔

پھر مثنوی۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم اور جاوید نامہ کا مطالعہ کریں۔ ان سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کسی استاد سے مدراس لیکچرز پڑھیں۔ ان لیکچرز کو سمجھنے کے لئے صرف ایم اے انگلش ہونا یا ڈاکٹر آف لٹریچر ہونا کافی نہیں ہے۔ واضح ہو کہ آپ کو اس کتاب میں قدم قدم پر ایک طرف رازی اور غزالی، ابنِ رشد اور ابنِ سینا، اشعری اور ماتریدی، ابن حزم اور شہرستانی سے اور دوسری طرف ہیگل اور کانٹ، نیٹشے اور برگساں، افلاطون اور ارسطو، وائٹ ہیڈ اور الیگزینڈر سے دوچار ہونا پڑیگا مختصر یہ کہ جب تک ۲۰۰۰ سال کی یورپین فلاسفی اور اور ایک ہزار سال کی اسلامی فلاسفی آپ کے پیش نظر نہ ہو، آپ اس کتاب سے اور اس کے مطالب سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

یہ کتاب کیا ہے؟ علامہ موصوف سے بڑھ کر اس کا جواب کون دے سکتا ہے؟ وہ ایک مرتبہ جبکہ میں اس کتاب کے متعلق ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ فرمانے لگے۔

"اگر اس علمی پایہ کی کوئی کتاب مامون الرشید کے عہد میں شائع ہوتی تو دنیائے اسلام میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا۔"

علامہ کے اس قول کے متعلق صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمان آج زندہ ہوتے تو وہ بھی اس کتاب کو پڑھتے اور آج بھی دنیائے اسلام میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا۔ لیکن جب مسلمان زندہ ہی نہیں تو پڑھے

کون؟ جان ولیم اور ہرچرن داس؟ انہیں کیا ضرورت پڑی ہے؟

میری عرصہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ علامہ کے فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب لکھ کر اس فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں جو علامہ کے ایک ادنیٰ کفش بردار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر لازم آتا ہے۔ میں تحدیثِ نعمت کے طور پر اظہار کرتا ہوں کہ میں ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہوں جنہوں نے گلشن راز جدید از اول تا آخر سبقاً سبقاً خود علامہ سے پڑھی ہے۔ اس لئے میں حق بجانب ہوں کہ اگر کفش برداروں میں اپنا شمار کرتا ہوں۔

لیکن ملازمت کے مشاغل کی وجہ سے مجھے وہ فرصت نصیب نہیں ہوتی جو اس عظیم الشان کام کے لئے درکار ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ سر دست ضربِ کلیم ہی کے متعلق اپنی ناقص فہم کے مطابق کچھ عرض کر کے مسلمانوں کو آبِ حیات کے اس چشمۂ لازوال کی طرف بلاؤں۔

دراصل چیز تو جاوید نامہ ہے جو بلا مبالغہ حقائق و معارف کا گنجینہ ہے۔ لیکن ضربِ کلیم ایک تو حال ہی میں شائع ہوئی ہے دوسرے اردو زبان میں ہے، تیسرے علامہ نے اس کتاب میں محض انگریزی اور فارسی سے نابلد مسلمانوں کی خاطر اپنی شخصیت، اپنے فلسفہ اور اپنے پیغام کو بالکل نمایاں کر دیا ہے۔

۱۹۳۰ء تک میں اس خیال میں تھا کہ مسلمانوں کا علمی ذوق بالکل مردہ نہیں ہوا ہے لیکن مدراس لیکچرز نے میری قوم کی تہی مائیگی کا راز بالکل فاش کر دیا اور مجھے بادلِ ناخواستہ اپنی رائے بدلنی پڑی۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ علامہ کے کلام کو سمجھنے والوں کی (Percentage) فیصدی تعداد کیا ہے۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں، انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر علامہ کی نظم "لا الہ الا اللہ" پڑھی گئی۔ جلسہ برخاست ہونے کے بعد بعض گریجوایٹوں کو مطلع کا مصرع ثانی یوں پڑھتے سنا:۔

"خودی ہے تیغِ فساں، لا الہ الا اللہ"

یہ سنکر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور سمجھنے والوں کی فیصدی تعداد دریافت کرنے کی کوشش سے سبکدوشی حاصل ہو گئی۔ *

---

* ناظرین معاف فرمائیں، بات میں سے بات نکل آتی ہے، علامہ کی یہ، غیر فانی نظم، فی الحقیقت

معرکتہ الآرا ثابت ہوئی۔ جو لوگ تہ سے آشنا تھے انہوں نے تو اسے حرزِ جان بنالیا لیکن جن کو مبدأ فیض سے کوتاہ نظری کا گلہ تھا۔ شاہدِ معنی کے دیدار سے محروم ہے۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق تنقید، تغلیط، تکذیب اصلاح اور مسابقت میں مصروف ہوگئے۔

جب اولادِ آدم نے قل ھو اللہ احد جیسی بے نظیر چیز کا جواب لکھنے کی کوشش کی ہے تو اگر علامہ کی اس نظم کو بعض حضرات نے معانی سے معرا سمجھا یا اس کا جواب لکھا تو کیا تعجب ہے۔

قرآن مجید میں ایک سورۃ ہے۔ القارعۃ ما القارعۃ وما ادراک ما القارعۃ۔

اس کا جواب کسی بزرگ نے یوں لکھا ہے۔ الفیل۔ ما الفیل۔ وما ادراک ما الفیل۔

علامہ فرماتے ہیں کہ خودی (ego) حامل اسرارِ نہانی ہے۔ اس میں بہت سی طاقتیں اور قوتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر کسی شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ ان اسرار و غوامض سے آگاہ ہو جائے۔ یا بالفاظ صحیح تر، اگر کوئی شخص اپنی خودی کی حقیقت سے واقف ہونا چاہے تو لازم ہے کہ پہلے حقیقت ثابتہ "لا الہ الا اللہ" پر صدق دل سے ایمان لائے۔ واضح ہو کہ صرف زبان سے "لا الہ الا اللہ" کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں خود علامہ فرماتے ہیں :۔

لا الہ گوئی؛ بگو از روئے جاں
تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں

ایں دو حرفِ 'لا الہ' گفتار نیست
'لا الہ' جز تیغِ بے زنہار نیست

مسلمان اگر آج ذلیل ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ بے زر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ 'لا الہ الا اللہ' کو 'از روئے جاں' کہنا بھلا چکا ہے اور صرف زبان سے کہنے پر اکتفا کرتا ہے۔ علامہ خود فرماتے ہیں :۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

(ضربِ کلیم)

مسلمان زبان سے تو کہتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی طاقت مجھے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر دل سے اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتا۔ یعنی دولت یقین سے محروم ہے۔ علامہ فرماتے ہیں :۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کی حامل ہے۔ باقی جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ زیادہ تر انہی دو چیزوں کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے۔ بجا ویدنامہ میں اپنے مخصوص افکار کی اشاعت کے علاوہ، آویزش شرق و غرب، فلسفۂ سیاست، تہذیب فرنگ، اسرار کائنات اور مدوجزر اسلامیان ہند، وغیرہ پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ لیکن جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

کا مصداق ہے۔ کہا سب کچھ ہے مگر اس انداز سے کہ صرف نکتہ رس طبائع مستفید ہو سکتی ہیں۔

لیکن ضرب کلیم کا انداز اس لحاظ سے بالکل بدلا ہوا ہے کہ یہاں ہر چیز صاف لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے۔ وہ جو ایک پردہ سا درمیان میں حائل تھا۔ بالکل اٹھ گیا ہے اور ناظورۂ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہے

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر ابتدا میں قوم کی ذہنیت کے متعلق حسن ظن رکھتا تھا۔ کہ اس کی قوم کے افراد اشارات اور کنایات کو سمجھ جائیں گے۔ کیونکہ "کنایہ بیاں سے افصح ہے" لیکن ۱۳-۱۴ سال کے تلخ تجربے نے شاعر کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا اور وہ بیتابی کے عالم میں "افشائے راز" پر مجبور ہو گیا۔

الغرض 'لا الہ الا اللہ' وہ کلید ہے جس سے خودی کے صندوق کا قفل کھل سکتا ہے۔ اب دوسرا مصرع پڑھیئے:۔

خودی ہے تیغ، فساں لاالہ الا اللہ

وہی تلوار معرکۂ کارزار میں اپنے جوہر دکھا سکتی ہے۔ جس پر باڑھ رکھی ہوئی ہو۔ یعنی جس تلوار میں دھار نہ ہو وہ قطعاً بیکار ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے مسلمان اگر تو چاہتا ہے کہ تیری خودی کی تلوار باطل کا سر قلم کر سکے تو 'لا الہ الا اللہ' کے پتھر پر رگڑ کر اسے تیز کر لے۔ یعنی کلمۂ توحید، خودی کے لئے وہی حکم رکھتا ہے جو سنگ فسان تیغ کے لئے رکھتی ہے توحید الٰہی کا عقیدہ اگر مسلمان کی رگ و پے میں جاری و ساری ہو جائے تو اس کی خودی ہی کام کر سکیگی جو تیغ آبدار کرتی ہے۔ اب پھر اس مطلع کو پڑھیئے:۔

خودی کا سر نہاں 'لا الہ الا اللہ' خودی ہے تیغ فساں لاالہ الا اللہ

اس مطلع کا ایک مطلب اور بھی ہے لیکن وہ الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے اسے قلمبند کرنے کی جرأت نہیں کی:۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

چند شعر ملاحظہ ہوں :-

(۱) حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا — تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

(۲) وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

(۳) توڑا نہیں جادو میری تکبیر نے تیرا — ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

(۴) یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار — جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

(۵) دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگاہ زلزلۂ عالمِ افکار

(۶) جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے — اے مردِ خدا، ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

(۷) ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر — فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

بہر حال اب میں چند مخصوص عنوانات کے ماتحت ضربِ کلیم کے بعض مقامات کو نمایاں کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) شاعر کا مرتبہ مقام اور شخصیت۔

علامہ نے اپنی تصنیفات ماقبل میں اپنی شخصیت کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ غالباً اسی سبب سے بہت سے لوگوں نے علامہ کو محض "ایک شاعر" سمجھ لیا، اور ان کے پیغام کی طرف اپنی توجہ مبذول نہ کی۔ چونکہ اس غلط فہمی سے شاعر کا مقصد فوت ہو رہا تھا۔ اس لئے مقامِ مسرت ہے کہ اس نے ضربِ کلیم میں بعض تصریحات ایسی کر دیں جن کی بدولت یہ غلط فہمی رفع ہو سکتی ہے اور اب ناظرینِ اقبال کے حقیقی مقام سے بآسانی واقف ہو سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ تصریح ان لوگوں کے لئے طوطیائے چشم ثابت ہوگی جو علامہ کے اشعار کو عروض اور قافیہ، زبان اور محاورہ کے پیمانہ سے ناپنے اور 'خدا مست' 'خود آگاہ' 'اور جہانِ خودی' وغیرہ ترکیبوں پر ناک بھوں چڑھانے کے عادی ہیں۔

آیئے! اب ضربِ کلیم کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں علامہ نے خود اپنے متعلق کیا کہا ہے۔

میرے اس خیال کی تائید، کہ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیغام کو بالکل واضح کر دیا ہے مندرجہ

ذیل قطعہ سے بخوبی ہو سکتی ہے :-

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا — تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثل شرر آوارہ نہ رہ — کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

آئیے اب ضرب کلیم کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں شاعر نے اپنے لئے خود کون سا مقام معین کیا ہے۔

(۱) شاعر کا مقصد حیات شعر گوئی یا فکر سخن نہیں بلکہ مردہ دلوں میں زندگی کی لہر پیدا کرنا۔ اور مشرقی اقوام کو تب و تاب عطا کرنا

عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو — کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بے باکی
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

(۲) بنی نوع آدم کو اُن کے حقیقی مرتبے سے آشنا کرنا اور خیالاتِ باطلہ کا پورے طور سے قلع قمع کرنا۔

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی — مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

(۳) فنونِ لطیفہ کے شیدائیوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا کہ اگر شعر، شاعری، مصوری، افسانہ نگاری موسیقی اور رقص سے روح بیدار نہ ہو، دلمیں سوزِ حیات پیدا نہ ہو تو یہ سب چیزیں بالکل بیکار ہیں۔ چنانچہ شاعر نے اس ضمن میں فنونِ لطیفہ پر جو تنقید کی ہے وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات — صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

(مصوری)

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل — نہ رہا زندہ و پایندہ تو کیا دل کی کشود
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام — حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

(موسیقی)

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم — اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لَے
ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

(شاعری)

وہ شعر کہ پیغام حیاتِ ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

(شعر)

چھوڑ یورپ کیلئے رقص بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی

صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن — صلہ اس رقص کا درویشی و شہنشاہی

(رقص)

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی ثابت ہو سکتی ہے کہ شاعر کے پاس بنی نوع آدم کے لئے ایک پیغام ہے جس کو اس نے کمال خوبصورتی کے ساتھ، نظم کی دل آویز صورت میں پیش کیا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ یقیناً وہ شاعر کے مقام حقیقی سے بھی واقف نہیں ہو سکتے۔

(ب) پنجابی نبوت

ضرب کلیم کے مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہو گی کہ پنجاب کی سرزمین نے "ایک نبی" پیدا کر کے مسلمانوں کے لئے، ایک عظیم الشان فتنہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ علامہ نے اس فتنہ کے ہولناک نتائج سے مسلمانوں کو ایک معرکتہ الآرا مضمون لکھ کر، آگاہ کر دیا جو اسلام اور احمدیت کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ضرب کلیم میں بھی اس کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا ہے۔

جہاد

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر

تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی، تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

مہدیٔ برحق

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

امامت

ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اسکی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

الہام

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام — ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے — غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

نبوت

وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگِ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

(ج) عورت

اگرچہ 'عورت' کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے بہت سے نادر نکتے اس کتاب میں بیان فرمائے ہیں لیکن اس کے مرتبہ کے متعلق جو تین اشعار سپردِ قلم کئے ہیں۔ فی الحقیقت بہت خوب ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ عورتوں میں کوئی عورت فلاسفر نہیں گزری لیکن اس کے لئے یہ شرف کیا کم ہے کہ وہ فلاسفروں کو پیدا کرتی ہے

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالماتِ فلاطوں، نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

(د) حقائق و معارف

حقائق و معارف نظم کرنے میں اقدرتِ خداوندی نے جو سلیقہ فائقہ ڈاکٹر صاحب کو عطا کیا ہے وہ نہ تو محتاجِ بیان ہے اور نہ یہ فقیرِ کج مج زبان، ان کی تشریح کا اہل ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں موجودہ زمانہ میں کوئی شہسوار ان کا ہمعنان نہیں ہے۔ یہ وہ بلندی ہے جہاں وہ تنہا کھڑے ہوئے ہیں۔ اسی جوہر نے انہیں حکیم اور حکیم الامت

القاب کا مستحق بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

تمہاری دغفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا اللہ سے بیگانہ

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

سے ہے گا تو ہی جہان میں یگانہ و یکتا | اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات | خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی | مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

تری خودی میں اگر انقلاب پیدا ہو | عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ | خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

(موازنہ)

(ہ) موجودہ تعلیم

موجودہ تعلیم، جو ہندیوں کو انگریزی مدارس میں دی جاتی ہے، سراسر ناقص اور مضر ہے۔ اس کا احساس اب عام طور سے سب کو ہونا جاتا ہے۔ علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں اس تعلیم پر تبصرہ فرمایا ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر | چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو | کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جنکو | خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

کیا ہے تجھکو کتابوں نے کور ذوق اتنا | صبا سے بھی نہ ملا تجھکو بوئے گل کا سراغ

(د) مسلمانوں کی حالت

علامہ نے اس کتاب میں موجودہ زمانہ کے علماء کا نقشہ نہایت صفائی کے ساتھ کھینچا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں | آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں | ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال — تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

قوم کیا چیز ہے؟ قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

(ف) سیاسیات

غلامی کا نقشہ اگرچہ علامہ نے زبورِ عجم میں خوب تفصیل کے ساتھ کھینچ دیا ہے۔ لیکن ضربِ کلیم میں علامہ کے افکار کی شراب بہت تیز ہو گئی ہے۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا اسیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب — کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک
مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی — سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے — خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے — ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو فلسفہ ہو، فقر ہو سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقاید کی بنا پر تعمیر

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو — مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے — ورائے سجدہ غلاموں کو اور ہے کیا کام

(ح) فلسفۂ فقر

علامہ نے ضربِ کلیم میں فقر کے فلسفہ کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فقر سے ان کی مراد مفلسی یا گداگری، عاجزی یا خاکساری نہیں بلکہ مسلمان کی وہ شانِ ایمانی جس کی بدولت وہ دنیا اور اس کے

متعلقات کو اپنی حیات کا مقصود نہیں بناتا بلکہ اسے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں استعمال کرتا ہے۔

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر — دوسرا نام اسی دین کا ہے 'فقرِ غیور'

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں "الفقر فخری" یعنی فقر میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ یہاں بھی فقر سے یہی مراد ہے کہ مومن وہ ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے اور اس کے حصول کی خاطر دنیا، دنیاوی طاقت، حکومت، لشکر، دولت، تن آسانی، فراوانی، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

علامہ فرماتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں میں یہ شانِ فقر باقی رہی وہ حکمران رہے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے دنیاوی حشمت کو اپنا مطمحِ نظر بنالیا تو خوار ہو گئے۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو — کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم — عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

فقر کا مقام شاہی سے بھی بلند ہے۔

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے — روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے

(ط) فلسفۂ خودی۔

خودی کا فلسفہ علامہ کا طغرائے امتیاز ہے۔ خودی ان کے افکارِ عالیہ کے لئے بمنزلہ مرکز ہے۔ اسی کی تہذیب و تربیت حیاتِ انسانی کا مقصود ہے۔ اسرارِ خودی سے لے کر ضربِ کلیم تک ہر تصنیف میں اسی حقیقت کو بکرات و مرات بیان کیا گیا ہے۔ اور علامہ نے جو کچھ لکھا ہے اسی کی تشریح و توضیح ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرہ کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانہ میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب — بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

سرود و شعر و سیاست کتاب دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں — ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات — خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو — کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

بے اشک سحرگاہی، تقویمِ خودی مشکل — یہ لالۂ پیکانی خوشتر ہے کنارِ جو

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے — اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا؟

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی — ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے، خدائی

میں نے بعجلت تمام، چند عنوانات کے ماتحت، ضربِ کلیم سے کچھ اشعار نقل کر دیے ہیں جن سے ناظرین کو کتاب کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ

دامانِ نگہ تنگ و گلِ چین تو بسیار — گلچینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

اس لاجواب کتاب کی خوبیاں مفصل طور پر بیان کرنے کیلئے، بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب درکار ہے عصرِ حاضر کا کوئی اہم مسئلہ ایسا نہیں جس پر علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ نہ فرمایا ہو۔

میں دلِ ناخواستہ اس شعرِ پُرتاثیر پر اس ناچیز مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

یہ کافری تو نہیں — کافری سے کم بھی نہیں — کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

اور قارئینِ کرام سے خواست کرتا ہوں کہ وہ علامہ موصوف کی سلامتی صحت اور درازیٔ عمر کے لئے صدقِ دل سے جنابِ باری میں دعا کریں۔

حدیثِ راز

جمعیتِ آدم

گفتگو یہ تھی کہ مغرب میں اشتراک خیال اور تہذیب و معاشرت کی یک رنگی کے باوجود قوموں کے مقاصد اور ان کے جذبات و محسوسات ایک دوسرے سے جسطرح الگ ہیں اسکی کوئی مثال مشرق سے نہیں ملتی یہ صحیح ہے کہ ان کی نفسانیت اور غلبۂ ذات کی خواہش نے افراد و اقوام کے اندر بغض و عداوت کی ایک کبھی نہ بجھنے والی آگ مشتعل کر رکھی ہے۔ لیکن محض اتحاد و انضباط اور عناصرِ ملی کے ربط باہمی کا خیال کیجئے تو انگلستان، فرانس جرمنی یا دوسرے ممالک کے شعور قومیت نے ان کی سیاحت و معیشت اور اخلاق و عادات کیطرح ان کے ادب، شاعری، فنون لطیفہ حتیٰ کہ مذہب اور فکر کی دنیا میں بھی ایک ایسا مذاق پیدا کر دیا ہے جو مشترک بھی ہے اور متمیز بھی۔

ارشاد ہوا کہ یہ صحیح ہے مگر قومیت کا ارتقاء عہد جدید کا ایک خاص مظہر ہے۔ مشرق میں زیادہ تر نسلی عصبیت کا زور رہا۔ ایک زمانے میں ترک، عرب، ایرانی سب اس جذبے سے متاثر تھے مغلوں کو ہی لے لیجئے۔ ہندوستان میں بجز عالمگیر کے اور کسی تیموری شہنشاہ کو اس امر کا خیال نہیں آیا کہ اس ملک میں اسلام کے مصالح سیاست کیا ہیں۔ اب کچھ دنوں سے اہلِ مشرق کا رجحان قومیت کی طرف ہے۔

"لیکن کیا اہلِ مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے یہ جدید تخیل کسی خوشگوار تبدیلی کا باعث ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔ اسلام کی رو سے دنیا کی نجات وحدتِ انسانی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نظام جماعت کی اساس کسی ایسے اصول پر نہیں جو انسان کی ذات سے باہر خارجی دنیا سے متعلق ہو بلکہ اس کا تصور سراسر نفسیاتی یعنی "ایمان" (توحید و رسالت) پر قائم ہے۔ لہٰذا اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا اقتضا قدرتاً یہ ہوگا کہ نسل یا وطن کی بجائے انسان کے ضمیر و قلب پر نظر رکھے اور اسطرح اس کے اتحاد و اشتراک کا راستہ کھولدے۔

"گویا اہلِ سیاست کا یہ کہنا کہ ہم قومیت کے ذریعے بین الاقوامیت پیدا کریں گے غلط ہے؟"

"قطعی۔ مغرب کی موجودہ آویزش اور انجمن اقوام کی ناکامیاں اس امر کا ایک ناقابل تردید اور بین ثبوت ہیں کہ جب تک اہلِ یورپ کی توجہ ذہنِ انسانی کی بجائے خارج پر ہے قومیت و بین الاقوامیت کا نزاع تفریق و انتشار کا باعث ہوتا رہے گا۔"

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں اپنا نظامِ سیاست و معیشت یکسر بدلنا ہوگا۔ اس لئے کہ ملک و دولت کے موجودہ تصورات سے اسلام کے اجتماعی نصب العین کا اتمام ناممکن ہے۔

بیشک اسلئے کہ اسلام کی نظر انسان پر ہے اور سیاستِ حاضرہ کی وطن، قوم یا معیشت پر لیں بھی جمیعت اقوام کا نتیجہ جمیعتِ آدم کس طرح ہو سکتا ہے؟"

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمیعتِ اقوام کہ جمیعتِ آدم؟

اس گفتگو کے بعد اکثر یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہندی مسلمان اپنے لئے کیا پسند کریگا؟
جمیعتِ اقوام کہ جمیعتِ آدم؟

"رازداں"

ایک افسانہ

باتونی

از سید نصیر احمد بی اے

(چیخوف کے ایک افسانہ کے زیر اثر لکھا گیا۔)

صفدر خاں جو کسی وقت فوج میں سپاہی تھا اور کئی جنگوں میں حصہ لے چکا تھا اب شہر کے شور و غل سے دور ایک چھوٹے سے قصبہ ہمیر پور میں رہتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ جوان، طاقتور، بہادر اور چست و چالاک تھا لیکن اب بڑھاپے میں اس کے بال سفید ہو گئے تھے اور کمر جھک گئی تھی۔ ایک دن وہ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ اس کے چہرہ پر پریشانی اور اضطراب کے آثار تھے۔ گاڑی میں نہ معلوم اسکے دل میں موت، آخرت اور جزا و سزا کے خیالات کیسے پیدا ہو گئے تھے انہیں خیالات کی وجہ سے اسے الجھن اور پریشانی تھی۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو ایک خوبصورت جوان اسی ڈبہ میں داخل ہو گیا۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ صفدر خان نے کہا "جی ہاں شادی کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ خود میری شادی اڑتالیس برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ لوگوں نے کہا یہ وقت شادی کرنے کا نہیں ہے لیکن میں نے کچھ پرواہ نہیں کی۔ آج کل کچھ عجیب زمانہ آ گیا ہے طبیعتیں بدل گئی ہیں۔ اس لئے میرا تو خیال ہے کہ شادی دیر ہی میں کرنی چاہئے۔ ہر شخص بہت جلد اپنی بیوی سے تنگ آ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے اگرچہ لوگ مارے شرم کے اسکا اظہار نہیں کرتے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ بیوی سے زیادہ بچے باعث عذاب ہوتے ہیں۔ میرے صرف دو لڑکے ہیں مگر خدا کی قسم اول درجہ کے بدمعاش اور پاجی۔ ہمارا قصبہ بہت چھوٹا سا ہے وہاں کوئی مدرسہ نہیں جہاں انہیں بھیجا جا سکے۔ اور اگر ہو بھی تو وہاں کیا خاک اصلاح ہو سکتی ہے۔ آج ملک بھر میں تعلیم کا زور ہے۔ مگر کیا اس سے نوجوانوں کی اصلاح ہو گئی ہے۔ کیا ان کے اخلاق درست ہو گئے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ میرے بیٹے جنگلیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں؟

نوجوان نے اطمینان و سکون سے سب باتیں سنیں اور بڑی نرمی سے ان کا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ وہ وکیل ہے اور بمبئی جا رہا ہے۔

'اوہ' صفدر نے تعجب سے کہا "بست نگر تو ہمارے گاؤں سے چھ میل دور ہے۔ ہم شام کے وقت کہیں ہمیرپور پہنچینگے۔ اس وقت وہاں سے بست نگر جانے کے لئے گھوڑے نہیں ملتے۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو رات غریب خانہ ہی میں بسر کیجئے۔ صبح آپ کو گھوڑا مل جائیگا۔ اور آپ آسانی سے بست نگر جا سکتے ہیں۔"

وکیل نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس تجویز کو منظور کر لیا۔

جب وہ ہمیرپور پہنچے تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اسٹیشن سے لے کر گھر پہنچنے تک انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ جب وہ مکان کے نزدیک پہنچے تو دو لڑکے باہر کھڑے تھے۔ ایک بیس برس کا تھا اور دوسرا کوئی تیرہ چودہ برس کا۔ دونوں کے پاؤں میں نہ جوتا تھا نہ سر پہ ٹوپیاں۔ عین اس وقت جب صفدر خاں اور اس کا مہمان ان کے پاس پہنچے تو ان میں سے چھوٹے نے ایک مرغی کو ہاتھ میں لے کر ہوا میں اچھالا۔ اور بڑے نے اس پر گولی چلا دی۔ مرغی بے جان زمین پر گر پڑی۔ "یہ میرے دونوں لڑکے ہیں" صفدر خان نے وکیل سے کہا" اور یہ نشانہ بازی کی مشق کر رہے ہیں۔"

مکان کے اندر ایک بوڑھی سی عورت تھی اور اس کے لباس سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کہ ملازمہ ہو۔ صفدر خاں نے کہا "جناب وکیل صاحب یہ میرے لڑکوں کی اماں جان ہیں۔" اور پھر اپنی بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کے لئے کھانا تیار کرو۔ مگر ذرا جلد۔"

مکان میں صرف دو کمرے تھے جن میں سے ایک سونے کے لئے استعمال ہوتا تھا اور دوسرا اٹھنے بیٹھنے کے لئے۔ دونوں کمروں میں کسی قسم کا سامانِ آرائش نہیں تھا۔ البتہ ایک کونہ میں دو تین بندوقیں اور شکار کا سامان پڑا تھا۔ کمرہ میں کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ البتہ ایک دو ٹوٹے پھوٹے چوکھٹے دیوار کے ساتھ لگے تھے۔

جب دسترخوان چن دیا گیا تو صفدر خاں اور اس کے مہمان نے کھانا شروع کیا۔ وکیل نے روٹی دال اور دہی سے کھائی مگر گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آپ گوشت کیوں نہیں کھاتے" میزبان نے تعجب سے پوچھا۔

"شکریہ۔ میں نہیں کھاتا" مہمان نے نرمی سے جواب دیا "میں گوشت بالکل نہیں کھاتا۔"

"کیوں۔ وجہ؟"

"میں سبزی خور ہوں۔ جانوروں کو مارنا میرے اصول کے خلاف ہے۔"

صفدر خاں نے اس جواب پر تھوڑی دیر غور کیا اور پھر آہ بھر کر کہا" ہوں - ٹھیک ہے - شہر میں بھی میں چند ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جو گوشت نہیں کھاتے - یہ ایک نیا مذہب ہے - آج کل تو نئے نئے مذہب ایجاد ہو رہے ہیں پیر صاحب کہتے ہیں کہ قوالی ضرور سنا کرو - ایک مولوی آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں آدمی کو مانو وہ اس زمانہ کا نبی ہے - دوسرا آدمی آتا ہے اور اس آدمی کی نسبت کہتا ہے کہ وہ نبی نہیں بلکہ کچھ اور ہے - نہ معلوم کیا - غرضیکہ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ - گوشت نہ کھانا بھی ایک نیا مذہب ہے - خیر اچھا ہے ہم ہر وقت جانوروں کو ذبح نہیں کر سکتے اور نہ انہیں مار سکتے ہیں پھر ایک بات اور بھی ہے - جب ہم خرگوش کو مارتے ہیں اور وہ زخمی ہو جاتا ہے - تو بیچارہ بچہ کی طرح چلاتا ہے - یقیناً اسے تکلیف ہوتی ہوگی -"

"یقیناً اسے تکلیف ہوتی ہے - جانور بھی آدمیوں کی طرح درد محسوس کرتے ہیں"۔

"بالکل صحیح ہے" صفدر خاں نے تائید کی " میں اسے خوب سمجھتا ہوں - لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی - فرض کیجیے کہ ہر ایک آدمی گوشت کھانا چھوڑ دے تو پرندوں کا کیا حال ہوگا - کوے چڑیاں وغیرہ؟"

"چڑیاں اور کوے جنگلی جانوروں کی طرح آزادی سے رہیں گی"۔

"اچھا اب میں سمجھا - کوے اور چڑیاں ہمارے بغیر اچھی طرح سے رہتی ہیں - ٹھیک ہے - مرغیاں - بطخیں، خرگوش اور ہرن آزادی سے پھریں گے - انہیں ہم سے خوف نہیں ہوگا - امن و امان کا زمانہ آجائیگا - لیکن ایک بات میرے دل میں کھٹکتی ہے"۔

صفدر خاں نے گوشت کی طرف دیکھ کر کہا " بھیڑ بکریوں - مرغیوں اور دوسرے گھریلو جانوروں سے ہم کس طرح نپٹینگے - ان کے ساتھ کیا ہوگا"۔

"وہ بھی دوسرے جانوروں کی طرح آزاد ہو جائیں گے"۔

"ہوں - درست - لیکن بھیڑ بکریوں اور دوسرے گھریلو جانوروں کو اگر ذبح نہ کیا جائے تو ان کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہو جائیگا - اس کا مطلب یہ ہے کہ باغوں اور کھیتوں کا بس خدا حافظ ہے - آپ جانتے ہی ہونگے اگر بھیڑ بکریوں کی حفاظت نہ کی جائے اور انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ باغوں اور کھیتوں کا ستیاناس کر دیں گی - باغوں اور کھیتوں میں جب کچھ نہ رہا تو ہم کھائیں گے کہاں سے - بھیڑ بکریوں اور دوسرے جانوروں کی زندگی شروع ہوگی اور ہماری موت"۔

کھانے کے بعد صفدر خاں نے اپنے کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اپنے آپ سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ اسے اہم اور سنجیدہ معاملات پر باتیں کرنیکا بہت شوق تھا۔ بڑھاپے میں اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کسی ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں موت کا ڈر نہ ہو۔ وہ اپنے آپ میں روحانی سکون سنجیدگی اعتماد اور استقلال پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ اس کے مہمان میں موجود تھا جس نے صرف دال روٹی پر گذارا کیا تھا۔ اگر انسان کسی بات کا ارادہ کرلے تو یقیناً کامیاب ہو جاتا ہے۔

صفدر خاں کمرہ سے باہر نکل گیا اور برآمدہ میں بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اب کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ آسمان پر تارے نکل آئے تھے لیکن مکان میں ابھی تک روشنی نہیں ہوئی تھی۔ اسوقت کمرہ میں کوئی خاموشی سے آیا اور دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ صفدر خاں کی بیوی تھی۔

"کیا آپ شہر سے آئے ہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے وکیل صاحب سے پوچھا۔

"ہاں میں شہر سے آیا ہوں۔"

"تو آپ پڑھے لکھے اور عقلمند ہیں۔ مہربانی کر کے ہمیں کوئی مفید مشورہ دیجئے۔"

"کس چیز کے متعلق؟"

"جناب ہمارے دو لڑکے ہیں۔ انہیں اب کسی مدرسہ میں ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمیں مشورہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اور میں عورت ذات ہوں۔ کچھ نہیں جانتی۔ اگر وہ تعلیم حاصل نہیں کریں گے تو بالکل آوارہ اور نکمے ہو جائیں گے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کچھ لکھ پڑھ نہیں سکتے اور کسانوں سے بھی بدتر ہیں۔ انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے لیکن قصور ان کا نہیں ہے۔ اف کس قدر افسوس ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ کچھ زیادہ نہ کہہ سکی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" صفدر خاں نے باہر سے آکر کہا "تم کو ان باتوں سے کیا مطلب معزز مہمان کو اس طرح تنگ کرنا ٹھیک نہیں۔ جاؤ۔"

وہ چپکے سے چلی گئی لیکن دروازہ کے پاس اس نے پھر یہ الفاظ دہرائے "اف کس قدر افسوس ہے"

ایک کمرہ میں مہمان کیلئے چارپائی پر بستر بچھا دیا گیا اور روشنی بھی کر دی گئی۔ صفدر خاں خود پاس والے کمرہ میں لیٹ گیا۔ وہ سویا نہیں بلکہ اپنی زندگی اور ملازمت پر غور کرنے لگا۔ وہ ان مسائل پر ہمیشہ فلسفیانہ رنگ میں

غور کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بڑا مفکر ہے اور دنیا میں سوائے سنجیدہ اور اہم معاملات کے اس کے لئے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسے اصول اپنے لئے وضع کرلے جن پر عمل کرکے وہ اپنی بقیہ زندگی بہتر بنا سکے۔ مثلاً ایک یہی اصول کہ گوشت کھانا چھوڑ دے۔ اگرچہ یہ عجیب سی بات ہے ...... وہ وقت جب آدمی ایک دوسرے کو قتل کرنا ترک کردیں گے اور جانور آزادی سے رہیں گے۔ کبھی نہ کبھی آئیگا ضرور۔ لیکن دفعتہ اس کے دل میں بھیڑ، بکریوں اور مرغیوں کا خیال آگیا اور اس کے دماغ میں الجھن پیدا ہوگئی۔

"خدا کی پناہ اس سے تو عجیب حالت ہوجائیگی۔ بھیڑ، بکریاں اور مرغیاں ہمیں تباہ کردیں گی۔ کیا آپ سو رہے ہیں"۔ اس نے پوچھا۔

"نہیں" وکیل نے جواب دیا۔

صفدر خاں اٹھ کر اپنے مہمان کے پاس چلا گیا۔ اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔ "آج کل ٹیلیفون، تار برقی، لاسکی اور طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہوگئی ہیں۔ لیکن لوگ بہتر نہیں ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے زمانہ میں لوگ ظالم اور بیرحم تھے۔ کیا اب بھی یہی حالت نہیں۔ جب میں فوج میں ملازم تھا تو ایکبار پہاڑ میں فوج کا قیام ہوا۔ وہاں ایک پہاڑی حاکم سے ہماری لڑائی ہوئی لیکن فتح کے بعد ہم نے اسے قتل کرکے پاس ہی دفن کردیا۔ اس کی بیوی ہر رات اس کی قبر پر آتی تھی۔ اور خوب چیخ چیخ کر آہ وزاری کیا کرتی تھی۔ اسی شور و غل کی وجہ سے ہماری نیند حرام ہوگئی۔ کئی راتوں تک ہم بالکل نہیں سو سکے آخر ایک شب سپاہیوں نے اس کو پکڑ کر خوب پیٹا اور اس کے بعد اس نے وہاں آنا چھوڑ دیا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا۔ یہ بات میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جناب لوگوں کی ظاہری حالت پر نہ جائیے۔ آج کل تو اتنے ظلم و ستم ہوتے ہیں کہ خدا بچائے۔"

مہمان نے کروٹ لی اور آہستہ سے کچھ کہا۔

"اچھا ایک بات اور سنئے" صفدر خاں بولا "جب یہاں طاعون زوروں پر تھی تو چودھری کا حکم تھا کہ اگر کوئی جانور مرجائے تو ایک گہرا گڑھا کھود کر اس کو دفن کردینا چاہئے۔ اور یہ کہ اس پر چونا ڈالنا بھی ضروری ہے اتفاق سے میرا گھوڑا مرگیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اسے ایک گہرے گڑھے میں گاڑ دیا اور کئی من چونا اس پر پھینک دیا۔ مگر آپ جانتے ہیں کیا ہوا۔ چودھری صاحب کے صاحبزادوں نے گھوڑے کو گڑھے سے نکال لیا۔ اور اس کی کھال کو کھینچ کر دو تین روپوں میں فروخت کردیا۔ آپ اسی واقعہ سے اندازہ لگا لیجئے کہ لوگ کچھ بہتر نہیں

ہوئے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔"

مہمان خاموش رہا۔ صفدر خاں اٹھا اور اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ دور سے بادل گرجنے کی آواز آرہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ "کیا آپ سو گئے"

"نہیں" مہمان نے جواب دیا۔

صفدر خاں اٹھا اور پانی کا ایک گلاس پی کر مہمان سے کہنا شروع کیا "آپ کو معلوم ہی ہے کہ دنیا میں سب سے بدتر چیز حماقت ہے۔ میری بیوی ہر روز نمازیں پڑھتی ہے اور یہ دعا کرتی ہے کہ اس کے بچے کچھ تعلیم حاصل کریں ورنہ ان کی زندگی تباہ ہو جائیگی۔ تعلیم کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ لیکن روپیہ کہاں سے آئے۔ اگر آپ اپنا سر بھی پھوڑیں تو بھی ایک پیسہ ہاتھ نہیں آسکتا۔ اور پھر وہ اپنے لئے بھی دعا مانگتی ہے ہر ایک عورت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں اس سے بدقسمت عورت اور کوئی نہیں۔ میں صاف گو آدمی ہوں اور آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میری بیوی کا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے۔ میں نے جب اس کے والد سے شادی کرنیکو کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ غریب تھا اور چاہتا تھا کہ خاندان کا ایک رکن تو کم ہو جائے میں بھی کوئی مالدار آدمی نہیں۔ لیکن آخر ملازم تھا اور مجھے تنخواہ ملتی تھی۔ شادی کے تیسرے چوتھے روز ہی سے وہ اپنی قسمت کو برا بھلا کہہ رہی ہے اور اب وہ ہمیشہ بیٹھ کر سوچتی رہتی ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں وہ کیا سوچتی ہے کچھ نہیں۔ میں تو عورت کو انسان نہیں سمجھتا۔"

مہمان اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا "میرا یہاں دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔"

دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے۔ چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہر چیز سفید تھی۔ منظر بڑا سہانا اور دلفریب تھا۔ وہ بڑی دیر تک ٹہلتے رہے۔ آخر وکیل نے پوچھا۔ "اب کیا وقت ہوگا۔"

"تین بجے ہونگے" صفدر خاں نے کہا۔

"اف ابھی تو صبح ہونے میں بڑی دیر ہے"

دونوں پھر اندر واپس آگئے۔ صفدر خاں چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس دنیا میں کوئی کام کرنا چاہئے۔ اگر کوئی کام نہ کیا تو زندگی کا کیا فائدہ یا تو دنیا کے اس سرے سے اس

سرے تک پیدل سفر یا پھر اس نوجوان مہمان کی طرح گوشت کھانا ترک کر دیا جائے۔ اس کے سامنے اس زمانہ کی تصویر پھر گئی جب سب جانور اور پرندے آزادی سے بے خوف و خطر رہا کریں گے لیکن دفعتہً بھیڑ بکریاں اور غزالیں اور دوسرے سب جانور اس کے سامنے آگئے۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ واقعی گوشت کھانے میں خدا نے کتنی زبردست مصلحت رکھی ہے۔ جانوروں اور پرندوں وغیرہ کو ذبح کرنیکا حکم کتنا معقول ہے۔ اگر ساری دنیا گوشت کھانا ترک کر دے تو انسان پر ایسی مصیبت نازل ہو کر دوسرے ہی دن چیں کر اٹھے۔

یہ دیکھ کر کہ اس کا مہمان بھی کروٹیں لے رہا ہے اس نے ذرا بلند آواز سے کہا۔ "جس فوج میں میں تھا۔ اس کا کرنیل بھی گوشت نہیں کھاتا تھا۔ وہ کبھی شکار کھیلنے نہیں گیا۔ اس نے اپنے ملازم کو بھی منع کر رکھا تھا کہ کبھی مچھلی نہ پکڑے یہ بالکل ٹھیک ہے اور اس بات کو میں سمجھتا ہوں کہ جانوروں کو آزادی سے رہنا چاہیئے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ بھیڑ بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کو کس طرح آزاد چھوڑا جا سکتا ہے۔"

مہمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور اضطراب کے آثار تھے معلوم ہوتا تھا۔ اسے سخت روحانی تکلیف ہو رہی ہے لیکن محض اپنی شرافت کی وجہ سے خاموش ہے۔

"اب روشنی ہو رہی ہے" بالآخر دیر کے بعد اس نے کہا۔ "برائے مہربانی گھوڑا تیار کروا دیجئے۔"

"ابھی سے ناشتہ کر کے جائیے گا۔"

"نہیں۔ بہت بہت شکریہ" مہمان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میرے لئے ابھی جانا بہت ضروری ہے" اور یہ کہہ کر اس نے کپڑے پہننے شروع کر دئے

جب گھوڑا تیار ہوا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مہمان کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ برآمدہ میں صفدر خان کی بیوی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غالباً وہ وکیل صاحب سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں سکتی تھی بیچاری کی حالت کس قدر افسوسناک تھی۔ یہ بیوی نہیں تھی۔ گھر کی مالکہ بھی نہیں ملازمہ بھی نہیں بلکہ ایک عورت جسکی کسی کو ضرورت نہیں تھی مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر۔

"آپ کس وقت آئیے گا" صفدر خان نے مہمان سے کہا "ہم سے جو کچھ ہو سکیگا آپ کی خاطر کرینگے" وکیل صاحب گھوڑے پر سوار ہوئے اور جلدی سے چل دئے انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے کسی مصیبت سے نجات ملی ہو۔ انہوں نے اپنے میزبان کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن شرافت نے انہیں روک لیا ۸۵

اور

عافیت منزل ما وادی خاموشانست
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

حرکت پیدا کیجئے

کیا آپ میں حرکت موجود ہے؟ اگر نہیں تو آپ کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ دنیا میں ہر جگہ حرکت کی کارفرمائی ہے۔ اس لفظ کے معنی لاروس سے کیا پوچھئے گا۔ اس کا جواب زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ارسطو کے فلسفہ کا مطالعہ کرو۔ اگر آپ اس کا مطلب سمجھنا چاہتے ہیں تو بیرن آلواسی کی تقاریر یا ہر گوئبلز کی خطیبانہ بلند آہنگیوں کو مدِ نظر رکھئے۔ ناطسی جرمنی نے جو کچھ کیا، اصولِ حرکت کے ماتحت کیا۔ ۱۹۳۵ء کی اسلحہ پوشی۔ رائنستان کی قلعہ بندی۔ یا اوکرین کو دھمکیاں۔ یہ سب کیا تھا؟ حرکت!

حرکت کا تصور نہ فیشطائیت کی ایجاد ہے نہ ہٹلریت کی۔ پچھلے زمانے میں بھی بہت سے متحرک انسان گذر چکے ہیں اسکندر اعظم، چنگیز خاں، فریڈرک ثانی اور نپولین۔ ارسطو اور ارسطو کی سیاسیات کو صدیاں گذر گئیں لیکن دنیا تقدیر کے چکر سے آزاد نہ ہوئی۔ ایک طرف جوش و خروش ہے اور وسعت و کشاد کی خواہش۔ دوسری جانب حسد ہے اور بغاوت۔ ایک آگے آگے اور دوسرا اس کے پیچھے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ یہ جرأت اور اگر جرأت نہیں تو دانشمندی ہے جو قوموں کی خواہشات کو ان کے ذرائع کے ماتحت لے آتی ہے لیکن حرکیات کا تعلق نہ جرأت سے ہے نہ دانشمندی سے۔ اس کے نزدیک تاریخ عبارت ہے بڑی بڑی عظیم الشان اجتماعی کوششوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی آمریتوں میں حرکت کا وہی تصور ہے جو کبھی بادشاہوں کے نزدیک حقِ سماوی کا تھا۔ لیکن بادشاہ باوجود مطلق العنانی کے اپنے امراء و وزرا، عمالِ کلیسا اور محبوب عورتوں کی خواہشات کے پابند تھے۔ برعکس اس کے جدید دنیا کا آمر ایک ایسی قوت کے زیر اثر ہے جو غیر متعین بھی ہے اور میکانیکی بھی۔ بالفاظِ دیگر حرکت وہ سماوی حق ہے جس کا نفاذ جرِ ثقیل کی طرح قدرتی طور پر ہوتا ہے یقین نہ ہو تو اس زمانے کے عجائبات ملاحظہ فرما لیجئے۔ ناکارہ انسانوں

کی رہنمائی آہنی ارادوں کے ہاتھ آئی ہے۔ اور طاقت ور قومیں انکسار اور فروتنی کا دامن پکڑ رہی ہیں۔

مشرق اور اہلِ مشرق حرکت سے عاری ہیں۔ ان کی طبیعتیں فطرتاً جمود اور بے حسی کو پسند کرتی ہیں۔ البتہ قومیت و وطنیت اور اشتراکیت کے نام پر اب کہیں کہیں حالات بدل رہے ہیں۔ بایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ چودھویں صدی کے ادعائے تجدید اور اکتسابی بنوت کے باوجود مسلمان ابھی تک حرکت سے محروم ہیں

—— البرٹ موسے اور...

افسانہ —— باتونی

ملاؔ لیکن ذرا دور جا کر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور غصہ سے چلا کر کہا۔ "تم نے اپنی باتوں سے میرا دماغ خراب کردیا ہے۔"

صفدر خاں ان الفاظ سے پریشان سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں مہمان کی یہ عجیب و غریب حرکت نہیں آئی۔ خیر! وہ آہستہ آہستہ کمرہ میں واپس آیا اور بیٹھ کر زلزلات کے واقعات، دنیا کی بے ثباتی، ٹیلیفون، تار برقی وغیرہ کے نقصانات پر غور کرنا شروع کیا۔ گوشت کھانے کے بارہ میں خدا کی مصلحت اور حکم خداوندی کا اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دہی سے رات کی باسی روٹیاں کھائیں اور سو گیا۔

جہانِ گزراں

رجال و مشاہیر

میاں سر فضل حسین مرحوم

میاں سر فضل حسین کا ماتم ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کیا گیا اور ان کے انتقال کو ہر خیال اور ہر عقیدہ کے مسلمانوں نے ملک و ملت کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ٹھہرایا۔ ان کے سیاسی مسلک سے بیشک بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا لیکن ان کی قابلیت۔ جرأت۔ ہردلعزیزی اور تدبر کے سب قائل تھے۔ اگرچہ وہ اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جسکو حکومت پرست کہا جاتا ہے مگر وہ خوشامد پسند نہ تھے۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھے جو حکومت کا ساتھ دے کر بھی اپنے ملک اور قوم کو فراموش نہیں کرتے۔ اپنی تمام زندگی میں وہ کسی سے نہیں دبے۔ وجہ یہ تھی کہ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا وہ اس کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیتے اور پھر اس پر مخالفت یا موافقت میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے کہ مخالف سے مخالف کو بھی اختلاف کی جرأت نہیں ہوتی تھی اور وہ ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ وہ آدمیوں پر چھا جاتے تھے۔ جو آدمی ان سے ایک دفعہ بھی ملا وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ ان میں کوئی ایسی کشش ہے جو اسکو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایک بات ان میں اور بھی بہت اچھی تھی۔ وہ جس راستہ کو قوم و ملک کے لئے مفید سمجھتے تھے۔ اس کو اختیار کر لیتے تھے اور کسی اعتراض یا مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مرحوم ایک عرصہ سے دق جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ اور وائسرائے کی کونسل سے الگ ہو کر بھی انہوں نے آرام نہیں کیا۔ بلکہ سیاسیات پنجاب کی الجھی ہوئی گتھی کو اپنی محنت اور ہمت سے سلجھانے میں مصروف ہو گئے اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ سیاسی جماعت بنائی اور ہر مخالفت سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں لگے رہے۔ نئے انتخابات میں ان کو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ دستِ اجل نے ان کو اتنی مہلت ہی نہیں دی۔

میاں صاحب مرحوم پر بعض لوگ یہ الزام لگاتے تھے کہ انہیں مسلمانوں کا خیال زیادہ تھا اور وہ ہندوؤں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی اصلیت نہیں۔ انہیں ہر قوم کا خیال تھا۔ مگر چونکہ پنجاب میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کی طرف اُن کی توجہ زیادہ تھی۔ اس سے ان کے مخالفین کے اندر غلط طور پر یہ احساس پیدا ہو کر کہ وہ مسلمانوں کے مفاد کو دوسروں سے مقدم سمجھتے ہیں۔ ویسے ملازمت کے معاملہ میں وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کو انگریزوں پر ترجیح دیتے تھے۔ البتہ میاں صاحب مرحوم کی کمزوری یہ تھی کہ وہ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہے۔ ان کی روش حکومت سے اتحاد و اتفاق کی روش تھی۔ اسلام کے جدید مسائل کو سمجھنا یا ان کے لئے جدوجہد کرنا ان کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

غرض سر فضل حسین مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی سیاست دانی، پختہ رائے، بیباکی اور اخلاص کا کون قائل نہیں۔ وہ نہایت فراخ دل انسان تھے اور ان کا کوئی دشمن بھی ان کی خوبیوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

بہ تلخیص و اضافہ

آثار و مقامات

استنبول

آج سے چھتیس سال پہلے جب میں پہلی مرتبہ استنبول گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانۂ متوسط پھر لوٹ آئی ہیں اور میں الف لیلیٰ کی پرشوکت دنیا میں کھڑا ہوں۔ غلطہ کا قدیم پل عبدالحمید خان کی اس "عثمانی سلطنت" کا جو ساحل ایڈریاٹک سے لیکر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا آئینہ تھا جس کے ناہموار چوبی تختوں پر ترک، عرب، کرد، بربر، بوسینوی، چرکسی، درویش، مانٹی نیگری (اہل جبل اسود)، یونانی اور دوسری یورپین اقوام، یہود، ارمن راہگیروں اور نقاب پوش خواتین کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ گویا غلطہ کا پل کیا تھا۔ برِ اعظموں کا جائے اتصال تھا!

لیکن دو مہینے ہوئے جب میں نے استنبول ایکسپریس سے نکلکر اسٹیشن پر قدم رکھا ہے تو میری حیرت کی

کوئی انتہا نہ رہی میں اسبات سے بے خبر نہیں تھا کہ آل عثمان کا مرکز حکومت بہت کچھ بدل گیا ہے مگر یہ توقع نہ تھی کہ جس استنبول کو میں نے دیکھا تھا ناپید ہو چکا ہے مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ یہ زوال پذیر اور مغربیت آلود شہر فے الواقعہ استنبول ہے چھتیس سال سے میں اورینٹ ایکسپریس کی ان تختیوں کو جن پر استنبول یا قسطنطنیہ کے الفاظ لکھے ہوتے تھے بڑے ذوق و شوق سے دیکھا کرتا تھا اور آج میں ایک غلیظ اور حقیر سے ہجوم میں کھڑا تھا جو معلوم ہوتا تھا استنبول کی بجائے کسی لائم ہاؤس یا دار سا کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہوتا ایک امریکن ٹیکسی کیب میں بیٹھ کر ہم بھیڑ کو چیرتے ہوئے شہر میں سے گذر گئے۔ پیرا کو دیکھا تو خیال ہوا کہ یورپ کے ایک ادنیٰ اور کم حیثیت قصبہ میں آ گئے ہیں۔ سڑکوں کے آس پاس غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے۔ . . . اس منظر کو دیکھ کر میرے دل پر یاس اور افسردگی کی ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ البتہ باب عالی میں پہنچ کر قسطنطنیہ کے قدیم جاہ و جلال کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ ایک دربان نے آگے بڑھ کر چھڑی اور کیمرے کو میرے ہاتھ سے لے لیا ——— باب عالی میں اب متحف قائم ہے ——— میں نے صحن میں قدم رکھا تو اس کی مرمریں محرابوں، ایک آہستہ آہستہ چلنے والے فوارے، عجیب و غریب پیڑوں اور حرم کی جالی دار کھڑکیوں کو دیکھ کر صدیوں کا منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یہاں ایک محل سے دوسرے محل کی سیر کرتے ہوئے جسمیں سمندر کا نیلگوں پانی اکثر نظر آ جاتا تھا میں استنبول کے حقیر شہریوں کو بھول گیا۔ حرم میں وہ عظیم دیوان ابتک موجود ہے جس پر شاہان آل عثمان اپنے مقربین کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اس پاس کے کمروں میں ان کے جواہرات اور خزائن بکھرے ہوئے تھے۔ تخت شاہی پر گلابی رنگ کا ایک ریشمین غلاف ڈالدیا گیا تھا جسمیں زر دوزی کے علاوہ سچے موتیوں کا کام بنا ہوا تھا۔ مختلف صحنوں میں سے گذرتے ہوئے جنکو سبز اور نیلے رنگ کے ترکی سفالوں سے آراستہ کیا گیا تھا میں اس حصے میں داخل ہوا جو خواجہ سراؤں کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اس مسجد کو دیکھا جسمیں درباری نماز ادا کرتے تھے۔ پھر والدۂ سلطان کے حماموں اور قیام گاہ کی سیر کی اور سب سے آخر میں بارگاہ سلطانی کی باری۔ ہمہ قدیم ترکی کی جھلک مجھے صرف جامع ایوب میں نظر آئی جو شاخ زریں پر واقع ہے اور جسے سلطان محمد فاتح کے حکم سے ۱۴۵۸ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے مرمریں صحن میں چنار کا ایک بہت بڑا درخت ہے (جہاں تک مری سیاحت کا تعلق ہے سب سے بڑا) یہیں میں نے ان ترکی خواتین کو دیکھا جو سیاہ ریشمک

پہنتے تیزی سے گزر رہی تھیں۔ ترک سپاہی اپنے ہاتھوں میں جوتے اٹھائے مسجد میں داخل ہو رہے تھے اور ایک پیرانہ سال مسلمان جس کے چہرے پر ڈاڑھی موجود تھی ایک ذبح کئے ہوئے جانور کو اپنے قلم تراش سے صاف کر رہا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر تک یورپ کے مراعات طلب اور تاجر پیشہ انسان ترکی کی سرزمین کو اپنا بہشت تصور کرتے تھے لیکن اب ہر طرف "ترکی ترکوں کے لئے" اور "ترکی اشیا خریدئے" کا شور ہے آج کل کا ترک تجارتی معاملات میں نہایت سختی کے ساتھ علیحدگی کی حمایت کرتا ہے۔ میری دانست میں شاید لارڈ بیوربک بھی اسکی پابندی نہ کرسکیں۔ نازی جرمنوں اور فسطائی اٹلی کی طرح ترکی حکومت بھی حب الوطنی کے لئے خاص پراپیگنڈا کر رہی ہے اور اس مقصد کی تبلیغ میں ہر ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے مثلاً ترکوں کا یہ کہنا کہ حضرت آدم بھی ترک تھے۔

مجھے یقین ہے کہ ترکی حکومت جس کی توجہ سر دست انقرہ کی تزئین و آرائش پر ہے ایک دن استنبول کی طرف بھی متوجہ ہوگی۔ لیکن اگرچہ یہ استنبول کو چل پھر کر دیکھنے میں کچھ لطف نہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ سمندر سے اس کا منظر اب بھی لاجواب ہے۔ ستمبر کی ایک حسین شام کو جب میں نے اسے الوداع کہی اور ہمارا جہاز بحیرۂ مارمورا میں داخل ہوا تو شفق آلود آسمان پر جبکہ ہلکا گلابی رنگ تمام افق پر پھیل رہا تھا قسطنطنیہ کی مساجد قطار در قطار میرے سامنے تھیں۔ اڑتے ہوئے نوارس میں ان کے سر بفلک میناروں کو دیکھ کر مجھے دفعتاً اس امر کا احساس ہوا کہ مشیئت ایزدی میں قسطنطنیہ کے لئے کیا ہونا مقدر ہے۔

——————— سر ایولن رنچ (اسپکٹیٹر)

تاریخ وسیاست

مصر اور انگلستان کا جدید عہدنامہ

پانچ دفعہ ناکام رہنے کے بعد جس کے وجوہ مختلف ہیں بالآخر چھٹی مرتبہ مصر و انگلستان کے درمیان ایک جدید معاہدہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس دفعہ بھی سخت جدوجہد اور طویل گفت وشنید کے بعد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جس طرح اطالوی جرمنی خطرہ سے انگلستان فرانس اور روس کو مجبور ہونا پڑا کہ درِ دانیال پر ترکوں کا حق تسلیم کرلیں۔ اسی طرح اطالوی خطرے کی بنا پر مصر اور انگلستان کو ایک ایسا معاہدہ کرنا پڑا جس سے یہ ڈر ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔ انگلستان کے مدبرین کا خیال تھا کہ مصر پر کسی نہ کسی طرح قبضہ رکھنے ہی میں فائدہ ہے۔ مگر حکومت برطانیہ نے ان کی مخالفت کی اور اسی سرزمین پر فاصبانہ تغلب کی بجائے اپنا مفاد اس بات میں دیکھا کہ مصر کو اپنا حلیف اور دوست بنالیا جائے لہٰذا انگلستان کے اس بدلتے ہوئے رویے کو دیکھ کر رہنمایان وفد نے بھی اپنے مطالبات میں کمی کا اعلان کردیا۔

۱۹۱۴ء تک حکومت برطانیہ برابر تسلیم کرتی رہی کہ مصر پر ترکوں کا حق سیادت قائم ہے گو اس کی فوجی اور آئینی مداخلت اس زمانے میں بھی جاری رہی معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ لیکن اسی زمانہ یعنی ۱۹۱۴ء میں دفعتہً جنگ عظیم شروع ہوگئی اور حکومت برطانیہ نے مصر پر قبضہ کرکے اسکو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا جنگ کے خاتمہ پر دنیا میں ایک انقلاب ہوگیا۔ ہر قوم اور ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ غلام اقوام نے یہ بات محسوس کی کہ آزادی ان کا فطری حق ہے اور اس فطری حق کو جس قیمت پر بھی ملے حاصل کرلینا چاہئے۔ دوسری قوموں کی طرح اہلِ مصر نے بھی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ حکومت برطانیہ نے مختلف طریقوں سے اس جوش کو دبانا چاہا۔ کبھی نرمی کی کبھی سختی برتی اور کبھی تحقیقاتی کمیشن بھیجے مگر اس کا مقابلہ جماعت وفد سے تھا جس نے ہر بات کو ٹھکرا دیا۔ آزادی کی تحریک نے اسقدر زور پکڑا کہ بالآخر حکومت کو بھی جھکنا پڑا اور ۱۹۲۳ء میں مصر کے آزاد ہونے کا اعلان کردیا گیا۔ مگر درحقیقت یہ آزادی صرف برائے نام تھی اس لئے کہ حکومت برطانیہ نے چار ایسی باتوں کو اپنے لئے محفوظ کرلیا تھا جن کی بنا پر وہ مصر کی کمزوریوں اور مجبوریوں

سے ہر وقت فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

بہر کیف جب مصر نے اس طرح کی نیم آزادی حاصل کر لی تو آئینی دستور کے مطابق حکومت کا سارا نظم و نسق جماعت وفد کے ہاتھ میں آگیا اس لئے کہ پارلیمنٹ میں اس حریت پسند فریق کو زبردست اکثریت حاصل تھی لہٰذا جب مصر اور حکومت برطانیہ کے درمیان ان امور پر گفت و شنید کی ابتدا ہوئی جن کو موخر الذکر نے اپنے مفاد کیلئے محفوظ کر رکھا تھا تو قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں۔ اور برطانیہ نے مختلف طریقوں سے کام لیتے ہوئے اس گفتگو کو کسی مفاہمت یا سمجھوتے پر پہنچنے نہیں دیا۔ اس کے خلاف اہل مصر نے کئی بار اظہار ناراضگی کے طور پر جوش و خروش سے کام لیا اور کئی بار حکومت برطانیہ کو جبر و تشدد سے کام لینا پڑا۔ مگر مصریوں کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ برابر اپنے حقوق کے لئے جنگ کرتے رہے۔ بالآخر برطانیہ کو مجبور ہونا پڑا۔ کہ مصر سے ایک جدید معاہدہ کرے۔ چار و ناچار جماعت وفد ہی سے گفت و شنید شروع ہوئی جس کی باتوں کو ماننے سے حکومت بارہا انکار کر چکی تھی۔ انگلستان اور مصر کا یہ جدید عہد نامہ مکمل ہو گیا ہے جس پر دستخط کر نیکے لئے مصری وفد بسر کردگی نحاس پاشا لندن روانہ ہو چکا ہے۔

فیصلہ یہ ہوا ہے کہ مصر کو انجمن اقوام میں شمولیت کا حق حاصل ہوگا۔ اور اس کے انتخاب کی تجویز خود انگلستان کی طرف سے پیش کی جائیگی۔ جنگ کی حالت میں ایک دوسرے کی فوری فوجی امداد کی جائیگی۔ مصری حکومت ان غیر ملکیوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہوگی جو مصر میں رہتے ہیں۔ شاہی رسل و رسائل کی حفاظت کے لئے برطانیہ کو ہوائی طاقت اور فوج کی ایک مقررہ تعداد رکھنے کی اجازت ہوگی۔ قاہرہ کا بریگیڈ اس وقت تک دار السلطنت سے نہیں ہٹایا جائیگا جب تک نہر سویز پر نئی بارکیں تعمیر نہ ہو جائیں۔

مصری وفد نے اس بات کو مان لیا ہے کہ اسکندریہ کے نواح میں چند سال کے لئے انگریزوں کو اپنی فوج رکھنے کی اجازت ہوگی۔ اور نہر سویز پر نئے ہوائی مستقر تعمیر کئے جائیں گے۔ پہلے معاہدہ میں رائل ائیر فورس کے ہوائی جہازوں کو صرف نہر سویز کے کنارہ کنارہ اڑنے کی اجازت تھی مگر اس معاہدہ کی رو سے وہ مصر میں ہر جگہ اڑ سکتے ہیں اور ہر ہوائی مستقر کو استعمال کر سکتے ہیں۔ مصری حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ ملک میں تین عمدہ فوجی سڑکیں بنوائے گی تاکہ مغرب سے مشرق کی طرف بوقت ضرورت فوجیں اور سامان لانے اور لیجانے میں آسانی ہو۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ میں یہ شرط تھی کہ ان سڑکوں کے تمام اخراجات حکومت مصر برداشت کرے مگر اس دفعہ

حکومت برطانیہ بھی ان اخراجات کا ایک حصہ ادا کرے گی۔

ان شرائط کے ماتحت برطانیہ نے مصر کی مکمل آزادی تسلیم کر لی ہے۔ حکومت مصر بغیر کسی پابندی کے اپنی فوج میں جس قدر چاہے اضافہ کر سکتی ہے۔ البتہ سوڈان کے متعلق بہت سا اختلاف رائے تھا اور واقعات نے ایک عجیب پیچیدہ صورت پیدا کر دی تھی مگر اب یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا ہے۔ حکومت برطانیہ نے سوڈان میں مصر کی شرکت تسلیم کر لی ہے۔ اور دونوں ممالک کے مابین طویل عرصہ کے لئے جارحانہ اور مدافعانہ معاہدہ مکمل ہو گیا ہے۔

بایں ہمہ ایک مسئلے کے متعلق دونوں ممالک کے مابین کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے اور یہ مسئلہ ان غیر ملکیوں کے متعلق ہے جنہیں اس سرزمین میں کسی نہ کسی طریق سے مخصوص امتیازات حاصل ہو چکے ہیں۔ اس کا فیصلہ یوں ہوگا کہ دونوں حکومتیں ان اقوام کی ایک نمائندہ کانفرنس منعقد کریں گی اور اس کانفرنس میں جو فیصلہ ہوگا۔ اسے منظور کر لیا جائیگا۔

یہ ملخص ہے اس معاہدہ کا جو مصر و انگلستان کے مابین طے پایا ہے اور جس پر دستخط کرنیکے لئے وزیر اعظم نحاس پاشا بڑی بڑی امیدیں لیکر لندن روانہ ہو چکے ہیں۔ دونوں ممالک میں اس معاہدہ پر مسرت و اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جدید معاہدہ کی رو سے مصر کی بین الاقوامی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے مگر یہ کہنا کہ مصر کو صحیح معنوں میں آزادی حاصل ہو گئی ہے غلط ہے۔ بہر حال اہل مصر نے اپنی جدوجہد اور عزم و استقلال سے ایک قدم اور آگے بڑھا لیا ہے جس کے لئے وہ بجا طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔

اسٹار، اسٹیٹسمین

بین الاقوامی دنیا

اسپین کی خانہ جنگی

آج کل اسپین میں خانہ جنگی زوروں پر ہے۔ ہر روز کشت وخون اور قتل وغارت کی خبریں آرہی ہیں حکومت کا دعویٰ یہ ہے کہ باغی دن بدن کمزور ہو رہے ہیں۔ اور عنقریب ختم ہو جائیں گے۔ دوسری طرف باغی یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ان کی جمعیت میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اصل میں صورت حالات کیا ہے لیکن اتنا بہرحال ضرور ہے کہ دونوں جماعتوں کا مقابلہ نہایت زبردست ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس خانہ جنگی کی وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے۔

سب سے پہلے ۱۴ اپریل ۱۹۳۱ء کو یاد کیجئے۔ اس دن شاہ الفانسو سیز دہم بالکل یکہ وتنہا رہ گیا تھا۔ اس کی فوج اس کے وزیروں اور اس کے درباریوں تک نے اسے اپنی قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔ محل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر چند لوگ یہ مشورہ کر رہے تھے کہ اسے قید کیا جائے یا نظر بند۔ الفانسو کے لئے فرار کا بہت اچھا موقعہ تھا۔ وہ چپکے چپکے میڈرڈ کے شاہی قصر میں سے پچھلے دروازے سے بھاگ نکلا۔ دوسری طرف گلیوں اور بازاروں میں لوگ اپنی فتحمندی اور کامیابی کے نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن الفانسو نے اپنے کان بند کر لئے۔ یہ واقعہ میونسپل انتخابات کے بعد کا ہے۔ ان انتخابات میں شاہی جماعت کو سخت شکست ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ وہ جماعت ہے جو تین سو سال سے برابر کامیاب ہوتی چلی آرہی تھی۔

الفانسو کی فراری کے بعد لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اب امن وامان کا زمانہ آگیا ہے اور وہ جبر وتشدد اور کشت وخون نہیں ہوگا جو کئی سو سال سے اسپین میں ہو رہا ہے اور جس کی وجہ سے یہ سرزمین رنگین بن گئی ہے الفانسو کو اسپین سے رخصت ہوئے ابھی صرف پانچ ہی برس ہوئے ہیں۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں حکومت میں نو بار تغیر وتبدل ہو چکا ہے۔ اس میں ۱۷ جولائی کا وہ تغیر شامل نہیں جس سے موجودہ خانہ جنگی اور بغاوت کی ابتدا ہوئی تھی اور وہ آئین جس کی وجہ سے یہ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ یورپ میں بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دستور نہایت قابلیت اور تدبیر سے مرتب کیا گیا ہے مگر اس میں ایک دفعہ ہے۔ بہت ہی

خطرناک اور تباہ کن - اور وہ یہ کہ حکومت جب اور جہاں چاہے مارشل لا کا نفاذ کر سکتی ہے - اور اسپین میں اس دفعہ کا مطلب کشت و خون اور قتل و غارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے -

جمہوریت کو قائم ہوئے ابھی ایک سال سے کچھ ہی اوپر ہوا تھا کہ اگست ۱۹۳۲ء میں جنرل سنجارجو نے نئی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی - مگر اسے ناکامی ہوئی اور اسے جان بچا کر بھاگنا پڑا -

جنرل سنجارجو کی مثال سے انتہا پسندوں اور انارکسٹوں میں حرکت پیدا ہوئی جو جمہوریت کے سخت مخالف تھے - چند ہی ہفتوں میں قیطیلونہ (Catalonia) اور اندلسیہ کے انارکسٹوں نے جمہوریت کے خلاف مسلح بغاوت کر دی - مور (Moor) فوجیں ان کے مقابلہ میں روانہ کی گئیں اور اس بغاوت کا خاتمہ کر دیا گیا -

ایک سال کے بعد ہی پہلی جمہوریت دفعتہً ختم ہو گئی - اب ملک کا نظم و نسق قدیم جمہوری جماعت اور کیتھولک جماعت کے ہاتھ آیا - یہ دونوں جماعتیں متحد ہو گئی تھیں - اول الذکر کا راہنما سنیئر لیراکس اور موخرالذکر کا گل رابلس تھا - گل رابلس اس جماعت کا راہنما بننے سے قبل ایک گمنام سا شخص تھا اور اسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا - اس نئی جمہوریت کے عہد حکومت میں کان کنوں کی بغاوت رونما ہوئی جس کا حکومت نے انتہائی جبر و تشدد سے خاتمہ کیا - اس کے بعد معمولی تغیرات قابل ذکر نہیں - یہاں تک کہ ہم ۱۷ اپریل تک پہنچتے ہیں اس دن فریق عوام جماعت کو انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی - یہ جماعت مندرجہ ذیل گروہوں میں منقسم تھی - اشتراکی گروہ، اشتمالی گروہ اور انتہا پسند جمہوری - موجودہ بغاوت کی وجہ اس فریق عوام جماعت کے برسر اقتدار آنے پر ہے - اس حکومت کی توجہ دو باتوں کی طرف بہت زیادہ تھی - زرعی اصلاحات اور قانون میں تبدیلیاں - لیکن انہوں نے اس کام کو جلدی نہیں کیا -

نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں کے گروہ نے انتہا پسند اشتراکیوں اور اشتمالیوں کی زیر سرکردگی کھیتوں اور زمینوں پر قبضہ شروع کر دیا اور جن مقامات پر کلیسا سے زبردست مخالفت تھی - انہوں نے وہاں گرجے جلا دیئے - کیتھولک جماعت کے ارکان نے ان کا مقابلہ کیا اور بہت سے اضلاع میں معمولی پیمانہ پر خانہ جنگی شروع ہو گئی - اس وقت شمالی علاقہ میں انتہا پسندوں نے ہڑتال پر ہڑتال شروع کر دی - اور ان کے راہنماؤں نے یہ اعلان کیا کہ اسپین کی نجات انقلاب اور آمریت میں ہے - اعتدال پسند اشتراکیوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس لہر کو روک سکیں - معلوم ایسا ہوتا تھا کہ جمہوریت کا خاتمہ قریب ہے - اس موقعہ کو دیکھ کر فیسطائی نوجوانوں

نے بھی مسلح ہو کر میڈرڈ اور دوسرے شہروں میں گھومنا شروع کر دیا۔ ان کی مٹھ بھیڑ اشتراکیوں اور اشتمالیوں سے یقینی تھی۔ اکثر مقامات پر ان کی دست بدست لڑائیاں ہوئیں جس سے صورتِ حالات اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔ طلبا اور کثیر تعداد مزدوروں نے فیشطائیوں کا ساتھ دیا۔ اب اسپین پر خانہ جنگی منڈلا رہی تھی۔ انہیں دنوں اشتراکیوں نے شہنشاہ پرست جماعت کے راہنما کالوسیٹلو کو مار ڈالا۔ اس کے قتل نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اور تمام اسپین میں لڑائی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سیٹلو وہی شخص ہے جو فتح ہونے کے بعد فیشطائی حکومت مرتب کرتا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ اس کی جگہ جنرل فرانکو اس جماعت کا راہنما مقرر ہوا۔ جنرل فرانکو اسپین میں بے حد ہر دلعزیز ہے۔ اس وقت اس کی عمر ۴۳ برس کی ہے۔ آج سے گیارہ سال پہلے وہ جنرل بنایا گیا تھا۔ اس نے بہت سی لڑائیوں میں حصہ لیا ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ آج تک کبھی زخمی نہیں ہوا۔ اس کے سپاہیوں کا خیال ہے کہ کوئی خوش نصیب ستارہ اس کا محافظ ہے۔ اس کا ساتھی بلکہ دایاں ہاتھ جنرل مولا ہے۔ جو شمالی اسپین میں باغیوں کا راہنما ہے۔ اسپین کی فوج میں صرف یہی ایک جنرل ہے جو عینک لگاتا ہے اس نے شہنشاہیت کے زوال پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں بہت سے لوگوں کو سخت سست کہا ہے حکومت کا راہنما مینویل ازانا ہے جس کی عمر پچپن برس کی ہے۔ اس کے بال بالکل بھورے ہو گئے ہیں طبقہ متوسط پر اس کا بہت اثر ہے۔ اس کا نائب لاگرو کبیلرو نامی ہے۔ جو بہت پرجوش انسان ہے۔

فرانکو، سیٹلو اور مولا نے بغاوت کی تحریک کو بہت وسیع کر لیا ہے۔ اور آبادی کے ایک بڑے حصہ کی ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں۔ تاریخ اسپین میں یہ پہلی بغاوت ہے جو اس قدر منظم ہے۔ لیکن تاہم کامیابی حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اس خانہ جنگی کا نتیجہ خواہ کچھ ہو مگر یہ طے شدہ امر ہے کہ اسپین میں آمریت ضرور قائم ہو کر رہے گی۔

——— سنڈے ایکسپریس

لاہور میں خرید و فروخت کی بہترین جگہ

دی یونائیٹڈ آکشن مارٹ

۲۵ میکلوڈ روڈ - لاہور

ہر قسم کا سامان نیا اور پرانا فرنیچر، دریاں چینی کے برتن وغیرہ وغیرہ نیلام میں یا ویسے روزمرہ تشریف لا کر خریدیے

یونائیٹڈ آکشن مارٹ میں سب سے بہتر اور سستی چیز ملتی ہے

۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

مولینا عبدالماجد دریابادی مدظلہ میدانِ صحافت میں

آپ کا ذاتی اخبار

سچ کی بجائے صدق

یکم مئی سنہ ۳۶ء سے ۲۷×۱۷/۴ ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر ہفتہ کی یکم۔ گیارہ اور انیس کو شائع ہوتا ہے ہمکو معلوم ہے کہ وہ صاحب ذوق حضرات جو مولینا عبدالماجد دریابادی کے طرزِ انشاء کے عاشق ہیں اور آپ کے مخصوص دلنشیں طرزِ صحافت کیلئے آپکے اخبار سچ کے بند ہونیکے بعد سے بیتاب تھے اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے لیکن چونکہ ہمارے پاس اخبار سچ کے خریداروں کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم فرداً فرداً خریدارانِ سچ کو نمونہ روانہ نہ کر سکے۔ لہذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپے جلد از جلد روانہ فرما کر خریدارانِ رجسٹر میں اپنا نام درج کرا لیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑیگا "صدق" ہر اعتبار سے "سچ" سے بڑھا ہوا ہے معنوی حیثیت سے مضامین فراقی کا اضافہ

سالانہ چندہ للعہ ر

ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۴۳ ہیوٹ روڈ لکھنو

بحث و نظر

١- ہمارے معاصرین

خاتِم اور خاتَم ——— صدق لکھنؤ، ۱۱ر جولائی ۱۹۳۶ء

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں خاتَم (بالفتح) اور خاتِم (بالکسر) پر بمعنی "مہر" طویل بحث ہے۔ نولڈیکی اور فرنیکل کی رائے میں 'خاتم' آرامی زبان سے آیا ہے اور تاج العروس میں اس مادہ کے گیارہ اشکال دیئے ہیں، جہاں واحد کے معنی مہر کے ہیں۔

لسان العرب میں ختام لقوم، خاتمہم، خاتوہم سب کے معنی 'آخرہم' کے دیئے ہیں۔ 'افضل' و 'اکمل' کے معنی نہ لسان العرب میں ملتے ہیں۔ نہ تاج العروس میں۔ زمخشری کی اساس البلاغہ اور لائل کے نسخہ مفضلیات سے بھی انہیں دونوں لغات کی تائید ہوتی ہے۔ فرزدق نے جہاں دونوں معانی کو جمع کرنا چاہا ہے وہاں محمد کے لئے خیر الخواتیم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ غرض یہ کہ عربی زبان و لغت سے، خاتم کے معنی 'افضل' و 'اکمل' کی سند کہیں سے بھی نہیں ملتی۔ قرآن میں جہاں یہ لفظ محمد کے لئے آیا ہے حسب تصریح تفسیر ابن جریر طبری حسن و عاصم کی قرأت میں خاتَم النبیین (بالفتح) ہے۔ مہر کے معنی ہیں۔ اور اکثر قرار کی قرأت میں خاتِم النبیین ہے بالکسر، آخر کے معنی ہیں۔ شرحِ شاطبیہ اور غایۃ النفع فی القرأۃ السبع میں بھی دونوں قرأتیں مذکور ہیں۔ تفسیر طبری اور تفسیر زمخشری میں عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے ایک تیسری قرأت نبیاً ختم النبیین بھی درج ہے یعنی وہ ہی جس نے انبیاء پر مہر لگا دی۔ مفسرین نے علی العموم 'خاتم' سے مراد "آخر" لی ہے اور میری نظر سے کسی تفسیر میں خاتم کے معنے اکمل کے نہیں گزرے۔

حدیث میں خود محمدؐ کی زبان سے لانبی بعدی آتا ہے، اور حدیث کی قدیم ترین کتاب موطائے مالک میں محمدؐ کے پانچ اسمائے خصوصی ہیں آپ کا نام عاقب آتا ہے جو 'آخر' ہی کا ہم معنی ہے۔ قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے بعد قدرتاً محمد کا آخری نبی ہونا عقائد اسلامی میں داخل ہے (شرح عقائد نسفی، وغیرہا)،

یہ اقتباس ہے اس مضمون کا جو مسلم ورلڈ کے جنوری نمبر میں عبدالرحیم صاحب نیر قادیانی کے اس استفسار کے جواب میں شائع ہوا کہ آیا خاتم کے معنی افضل یا اکمل کے ہیں؟ گویا رسول اللہ صلعم کے بعد نبی تو آسکتا ہے البتہ نئی شریعت نہیں ہوگی۔ اور جس میں بوضاحت ثابت کر دیا گیا ہے کہ خاتم اور خاتم دونوں کے معنی بجز "آخری" نبی کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ مسلم ورلڈ ایک مسیحی رسالہ ہے اور بالفاظ مولانا عبدالماجد دریا آبادی مشہور دشمن اسلام محقق پادری زویمر اس کے ایڈیٹر ہیں۔ نیر صاحب کی غلط سلط تاویلات کے مقابلے میں جو سکت دلائل مسلم ورلڈ نے پیش کئے ہیں ان پر رائے زنی کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:—

قادیان کو خدا جانے امریکہ سے استفسار کرنیکی کیا ضرورت تھی۔ خیر اپنی مصلحتوں کو تو اہل قادیان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جواب بہرحال نئی دنیا کے روشن خیالوں سے بھی وہی ملا، جو "پرانی دنیا" کے قدامت پرست مدت سے دیتے چلے آئے ہیں۔ یعنی خاتم کا بمعنی 'آخر' کے ہونا۔ اور 'مہر' بھی لئے جائیں تو مہر بھی تو خط کے آخر میں اور خاتمہ پر ہی ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ ایسی مہر جس سے دوسرے انبیاء ڈھلنے جائیں! ایسی عجیب و غریب مہر جو گویا کارخانہ نبوت سازی کے لئے بطور ٹریڈ مارک کا کام دے۔ بجز قادیان کے ایجاد گھر کے اور کہاں سے مل سکتی ہے؟

اورنگ زیب کا عہد —— معارف اگست ۱۹۳۶ء

حال ہی میں ڈی، بی، تاراپور والا، ہاربنی روڈ بمبئی نے جناب ظہیرالدین صاحب فاروقی بی اے ایل ایل بی بیرسٹر ایٹ لاء بہرائچ کی انگریزی تصنیف اورنگ زیب اور اس کا عہد شائع کی ہے جس کے مطالب کا ایک طویل خلاصہ معارف اعظم گڑھ میں چھپا ہے۔ پوری کتاب چوبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں لائق مصنف نے ان تمام غلط فہمیوں کا نہایت کامیابی اور دقت نظر سے ازالہ کیا ہے جو عالمگیر کی ذات کے متعلق عام طور سے مشہور ہیں۔ انہوں نے عالمگیر کے عہد کی صحیح تاریخی نوعیت پر جس قابلیت سے روشنی ڈالی ہے اس کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہو سکتا ہے:—

سترہویں صدی کے اواخر کے ردعمل کے تمام جراثیم اکبر کے اس طرز عمل میں پائے جاتے ہیں۔ جو اس نے

۱۔ کتاب خانہ طلوع اسلام ۵ میکلوڈ روڈ لاہور سے بھی مل سکتی ہے۔ کتاب انگریزی میں ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے اختیار کیا۔ . . . . اکبر کی رواداری مسلمانوں کے لئے نہ تھی۔ بلکہ اسے ان کے جذبات کو صدمہ پہنچانے میں لطف ملتا تھا۔ اس کے الحاد سے مسلمانوں میں شورشیں اور بغاوتیں ظہور پذیر ہونے لگیں لیکن اس نے اپنے آہنی پنجوں سے انہیں فرو کیا۔ مسلمانوں کے جذبات کی اشتعال انگیزی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اکبر ابھی بستر مرگ پر ہی تھا کہ جہانگیر سے جس کی تخت نشینی بالکل متیقن نہیں تھی بارہہ کے سادات نے حلف لیا کہ وہ ہر ممکن کوشش سے اسلام کی عزت و ناموس کا تحفظ کریگا۔ . . . . . شاہجہان کے عہد میں یہ پرانا زخم دارا کے مشکوک اور مشبہ معتقدات کی شکل میں پھر ابھر آیا۔ دارا نے ان تمام ذرائع کو استعمال کیا جو اس کے دادا نے کیا تھا۔ اس صورت حال میں راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اورنگ زیب کا بحیثیت دہندہ کی حیثیت سے خیر مقدم کیا۔ وہ جانتے تھے کہ دارا اکبر کے نقش قدم پر چلیگا، پس اورنگ زیب کو اپنے ماحول کا پیداوار سمجھنا چاہیئے اور اس کی حکومت کے تمام واقعات کو انفرادی طریقہ سے نہیں بلکہ اسباب کے تسلسل کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے اورنگ زیب کا عہد شروع سے آخر تک اکبر اور دارا کے غیر مآل اندیشانہ رویہ کے ردعمل سے بھرا ہے۔

اقبال ——— "پوئٹری ریویو" جولائی اگست ۱۹۳۶ء

۲۶ نومبر ۱۹۳۵ء کو مولوی سید ہاشمی صاحب نے "انجمن شعر" کے "مرکز عام حیدرآباد" میں اقبال پر ایک مقالہ پڑھا جس کا انگریزی ترجمہ "پوئٹری ریویو" نے شائع کیا ہے۔ اس موقعہ پر اقبال کی متعدد نظمیں گا کر سنائی گئیں۔ بعض کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے جو بزم میں موجود تھیں شاعر کی زندگی کے بعض حالات بیان کئے۔ ہاشمی صاحب کے مقالے میں سے ذیل کا اقتباس غالباً قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا:۔

حالی کے برعکس جو صرف ملت اسلامیہ کی اصلاح و تجدید کے آرزومند تھے۔ نوجوان اقبال نے حب الوطنی کو اپنا موضوع بنایا۔ . . . . ایک حیدرآبادی ملازم ریاست کا بیان ہے کہ انہوں نے نیلگری کی پہاڑیوں میں چرواہوں کو "ہندی ترانہ" گاتے ہوئے سنا۔ . . . . وطن کی محبت میں اقبال کا یہ جوش و خروش کچھ بہت زیادہ تعجب انگیز نہیں۔ اس لئے کہ یہ پچھلی صدی کے آخری پچیس سال تھے جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ جذبات وطنیت کو تحریک ہوئی۔ لیکن اس کا ردعمل بھی فوراً ہی شروع ہوگیا اور اقبال کا نیا شوالہ اپنی تعمیر سے پہلے ہی منہدم ہوگیا۔ یہ امر اور بھی زیادہ قابل ذکر ہے کہ وطن پرستی کے مغربی تخیلات کی مخالفت اس تہذیب کے

مراکزِ علم و ہنر ہی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ . . . . اور اقبال کو یقین ہو گیا کہ انسان کو جغرافی، لسانی اور نسلی امتیازات کی بنا پر الگ الگ قوموں میں تقسیم کرنا نہ صرف فطرت کے خلاف بلکہ نوعِ انسانی کے لئے ایک خطرہ ہے۔ . . . اقبال کے مطمحِ نظر میں ایک دوسری تبدیلی اسلام اور اسلامی ادبیات کے ایک نہایت ہی گہرے اور عمیق مطالعے سے پیدا ہوئی۔ لہٰذا یہ ایک عجیب بات ہے کہ شاعر جبھی یورپ سے واپس آیا تو جدید تعلیم کے باوجود ایک پکا مسلمان بنکر آیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ انسان کے تمام آلام و مصائب کا علاج صرف تعلیماتِ قرآنی میں ہے . . . اس وقت سے لے کر اب تک اقبال کا سارا فلسفہ و حکمت اس امر کے لئے وقف ہے کہ مسلمانوں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام عالم کو اسلام کا پیغام سنائے۔ . . . . . . ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و تجدید اور اسکے احیا کے لئے اقبال نے اپنے علم و فضل اور غیر معمولی ذہانت و طباعی کی بدولت زندگی کا ایک تقریباً نیا فلسفہ مرتب کیا ہے جسکا اظہار اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں ہوا۔ . . لیکن اسلام کے لئے اقبال کی یہ والہانہ شیفتگی ان کے غیر مسلم یا وطن پرست قدردانوں کے لئے مایوسی کا باعث نہیں ہوئی اس لئے کہ اقبال کا عقیدہ دوسرے ادیان و مذاہب یا تہذیبوں کی مذمت پر قائم نہیں۔ . . . . قدیم ہندوستان اور ہندی رشیوں کا ذکر اس نے ہمیشہ احترام سے کیا ہے . . . . علیٰ ہٰذا پیامِ مشرق ایک طرح سے یورپ کی فضیلت اور برتری کا اعتراف ہے۔ . . . . . بایں ہمہ اقبال نے مادیت، سرمایہ داری اور شہنشاہیت کی جو اس کے نزدیک تہذیبِ مغرب کے سہ گانہ عناصر ہیں ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ یورپ کا موجودہ طرزِ جمہوریت بھی شاعر کو پسند نہیں اور اخوتِ انسانی اور حقوقِ مزدوراں کی حمایت کے باوجود اس نے کارل مارکس کو ایک گمراہ پیغمبر سے تعبیر کیا ہے جس نے اپنے عقیدے کی بنا مساواتِ شکم پر رکھی۔

اقبال نے اپنے کلام میں عہدِ جدید کے ہر اہم مبحث اور قابلِ ذکر رجحان پر فلسفیانہ رنگ میں تنقید کی ہے۔ . . . . . . بایں ہمہ اقبال کی شاعری محض تعلیم یا اصلاح تک محدود نہیں۔ ان کے تغزل پر روحِ انسانی وجد کرتی ہے۔ . . . . ہمارا ادب حسن اور عشق کے ان تصورات سے محروم تھا جو اقبال نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ . . . . مختصراً اقبال کا پیغام جو بتدریج ایک عالمگیر شکل اختیار کرتا جاتا ہے یہ ہے کہ انسان کی آرزوئیں اور اس کے مقاصد غرض اور نفعِ ذات کے

شائبے سے پاک ہوں - وہ ان کے حصول میں ایک غیر متزلزل یقین اور عشق و محبت سے کام لیتے ہوئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ امید اور کامرانی اقبال کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز ہے اور کو اسلام اور تہذیب جدید اس کا سب سے بڑا موضوع ہے لیکن اقبال کا منتہائے نظر ——— حتیٰ کہ غزلیات میں بھی ——— ان دو باتوں کے سوا غالباً کچھ نہیں ——— زندگی اور قوت ۔

دورِ جدید ——— لاہور (بقیہ نقد و تبصرہ)

ایک ہفتہ وار اخبار، زیر ادارت ملک احمد حسن رہنمائی، حجم ۱۶ صفحات، قیمت پانچ روپے سالانہ۔

دورِ جدید جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے سیاسی، ادبی اور دلچسپ علمی معلومات کا ہفتہ وار اخبار ہے لیکن اس کے سیاسی مباحث حکومت پرست سیاست تک محدود ہیں۔ ادبی حصے میں مفید اور دلچسپ معلومات جمع کی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے احرار کی مخالفت سے اسے خاص دلچسپی ہے حالانکہ اگر مدیر اخبار فرقہ مرزائیہ سے تعلق رکھتے ہیں تو سوچنا چاہئے کہ اگر احراری رہنماؤں میں کچھ نقائص موجود ہیں تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ ان کے اپنے عقاید اور طرز عمل اسلام کے مطابق ہے

معین الشفا ——— لاہور

ایک طبی رسالہ حجم ۴۰ صفحات چندہ سالانہ عہ۔

یہ رسالہ سید ظفر یاب علی صاحب عاذق الہند کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور مختلف طبی مباحث میں منقسم ہے۔ امید ہے اس کا اجرا ملکی طب کی حفاظت و تجدید اور طلبا کیلئے خاص طور سے مفید ثابت ہوگا۔

تحریک اتحاد اسلامی یا پیام کشفی

یہ ایک مختصر سا رسالہ جناب کشفی شاہ صاحب نے رنگون سے شائع کیا ہے جس میں مختلف عنوانات کے ماتحت مسلمانوں کو اتحاد و یک جہتی کی دعوت دی گئی ہے۔ رسالہ نہایت مفید ہے اور جو لوگ اس کا اقرار کریں کہ وہ اسے پڑھ کر مسلمانوں کو سنائیں گے نہیں مفت دیا جائیگا۔

ملنے کا پتہ:۔ مصنف سے (پوسٹ بکس نمبر ۳۲۶ رنگون طلب کیجئے

نقد و تبصرہ

انجمن حمایت اسلام کا عکسی قرآن مجید[1]

ہدیہ قسم خاص پچیس روپے قسم اول پانچ روپے قسم دوم تین روپے

انجمن حمایت اسلام لاہور نے مروجہ ہندوستانی مصاحف کی غلطیوں اور ناشران قرآن کی بے حسی سے متاثر ہو کر آج سے سات آٹھ سال پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے قرآن پاک کا ایک مستند عکسی نسخہ شائع کرنا چاہیئے۔ یہ عظیم الشان خدمت جس میں کتابت، طباعت، شمار آیات، رسم الخط، حرکات و ضوابط رموز و اوقاف، عنوانِ سور، اندراجات رکوع اور پاروں کی ترتیب میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے بالآخر انجمن کی مجلس طبع و تالیف نے پروفیسر ظفر اقبال صاحب کی نگرانی میں جنہوں نے درس و تدریس کی مصروفیتوں کے باوجود اپنا سارا وقت محض لوجہ اللہ انجمن کی نذر کر دیا نہایت کامیابی کے ساتھ سرانجام دی۔ عجیب بات ہے کہ جو کام بڑی بڑی اسلامی بادشاہتوں کے کرنے کا تھا وہ شمالی ہند کی ایک غریب انجمن کے ہاتھوں پورا ہوا۔ اس غیر معمولی سعادت پر انجمن حمایت اسلام ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہے۔ حسن خط حسن صورت اور حسن صحت کے اعتبار سے قرآن پاک کا یہ نسخہ بے نظیر ہے۔ اس کے تمام حروف اور تمام اعراب اپنے اپنے محل پر ہیں۔ اوقاف کے متعلق انتہائی اہتمام کیا گیا ہے جس صفحے کو کھولئے۔ پارہ، سورت منزل اور آغاز و انجام کی آیات کا نمبر معلوم ہو سکتا ہے۔ حوالے کی سہولت کے لئے متعدد فہرستیں موجود ہیں جنہیں مختلف صورتوں میں ترتیب دیا گیا ہے تاکہ وہ قرآن پاک کے مطالعہ میں "انڈکس" کا کام دے سکیں انجمن حمایت اسلام نے اعلان کیا ہے کہ جو شخص اس نسخے میں ایک زیر و زبر کی غلطی بھی معلوم کریگا۔ اُسے فی غلطی ایک اشرفی انعام دیا جائیگا۔ ہمیں یقین ہے کہ مسلمانانِ ہند انجمن کی اس عظیم الشان خدمت کی قدر کرینگے اور قرآن پاک کے مروجہ مطلا اور منقش نسخوں کی بجائے انجمن کے عکسی قرآن مجید کا ایک نسخہ ضرور اپنے پاس رکھینگے۔ اسلئے کہ قرآن پاک کی صحیح تلاوت ہر مسلمان کا فرض ہے اور انجمن کے عکسی قرآن میں تو ظاہری اور معنوی سب خصائص موجود ہیں۔

---

[1] کتاب خانہ طلوعِ اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور سے طلب کر سکتے ہیں۔

محمد النبی صلعم (انگریزی) ——— ایک مقالہ

تالیف فضل کریم خان صاحب درانی مدیر ٹروتھ مجلد حجم ۱۴۰ صفحات قیمت دو روپے

یہ جناب فضل کریم خاں صاحب درانی مدیر ٹروتھ کا ایک مقالہ ہے جس کا تعارف جناب عبداللہ یوسف علی صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج نے رقم فرمایا ہے۔ جن لوگوں نے ٹروتھ کا مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ درانی صاحب اپنے دل میں خدمتِ اسلام کا کسقدر صحیح اور سچا ولولہ رکھتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ جس میں انہوں نے آنحضرت صلعم کی سیرت مقدسہ کو پانچ عنوانات میں تقسیم کیا ہے اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ حضور سرور کائنات کے مرتبہ و مقام کو تاریخِ عالم کی روشنی میں واضح کیا جائے۔ انہوں نے بجا طور پر علامہ اقبال کے اس شعر کو۔ می توانی منکر از یزداں شدن منکر از شانِ نبی نتواں شدن

سرورق میں جگہ دی ہے۔ درانی صاحب اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ ان کی تحریر میں غیر معمولی روانی، زورِ دلائل اور تاریخی شواہد کا غلبہ ہے۔ تاریخ کے ایک وسیع النظر طالب علم اور سوانح نگار کی جو مثال انہوں نے پیش کی ہے وہ ہر اعتبار سے مستحق مبارکباد ہے۔ البتہ دیباچے میں جہاں انہوں نے مسلمانوں کے موجودہ ذہنی انحطاط کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے ایک آدھ فقرہ شاید بعض حلقوں میں قابلِ اعتراض ہو۔ بہرکیف ان کا یہ مقالہ انگریزی زبان کے اسلامی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جس کا مطالعہ انگریزی تعلیمیافتہ مسلمانوں کیلئے خاص طور سے مفید ثابت ہوگا۔ کیا اچھا ہوتا اگر درانی صاحب کو اتنی فرصت ہوتی کہ وہ ان مباحث پر زیادہ تفصیل کے ساتھ قلم اٹھا سکتے۔

اچھوت اور اسلام

یہ جناب درانی صاحب کا ایک مختصر مگر نہایت ہی مفید رسالہ ہے جس میں اچھوتوں کو بدلائل قبولیت اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ تبلیغی اغراض کیلئے انگریزی زبان میں اس سے بہتر مقالہ شاید ہی اس مسئلے پر لکھا گیا ہو ذی اثر مسلمانوں کا فرض ہے کہ بکثرت خرید کر اسے غیر اسلامی حلقوں میں تقسیم کریں۔ قیمت ۸ ر

ملت اسلامیہ اور بیمہ

یہ سولہ صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جسے ڈاکٹر سید محمد شریف صاحب منتظم مینیجنگ ڈائریکٹر مسلم انڈیا

انشورنس کمپنی لمیٹڈ (لاہور) نے بدلائل تبلایا ہے کہ بیمہ کسیطرح بھی ربا اور سود یا قمار بازی اور جوئے میں داخل نہیں۔ وہ کہتے ہیں بیمہ کمپنی ایک تجارتی ادارہ ہے جسکے تمام قواعد و ضوابط "معاملہ بالدین" کے تحت میں آتے ہیں۔ لہٰذا شرعًا یا عقلاً بیمہ زندگی کو ناجائز قرار دینا غلطی ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام جس نے مذہب کو اجتماعی اور قومی رنگ میں پیش کیا ہے تجارت میں بھی اسی امر کو مدِنظر رکھتا ہے۔ لہٰذا اقتصادی ترقی اور خوشحالی کیلئے مسلمانوں کا بنک اور بیمہ کمپنیوں میں حصہ لینا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دلائل نہایت قوی ہیں اور اگرچہ اصولی اعتبار سے انمیں گفتگو کی بہت گنجائش ہے مگر ایک بات ظاہر ہے اور وہ یہ کہ بحالتِ موجودہ ہم ان کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں شمالی ہندوستان کی یہ واحد اسلامی کمپنی غیر معمولی کامیابی اور ترقی حاصل کریگی

شناخت مجدد

تصنیف پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایم اے مطبوعہ پیکو آرٹ پریس۔ قیمت ۸ ر

یہ پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی ایم اے پرنسپل اشاعت اسلام کالج کا ایک مضمون ہے جو اول رسالہ حقیقت اسلام میں شائع ہوا اور جسمیں پروفیسر صاحب نے مرزا صاحب قادیانی کی سوانح حیات اور انکی تحریر و تقریر سے بوضاحت اس امر کو ثابت کیا ہے کہ وہ کسیطرح بھی منصبِ مجددیت کے اہل نہ تھے۔ پروفیسر صاحب نے نہایت کامیابی کیساتھ تبلایا ہے کہ مجدد کیلئے جو خصائص مثلاً سیرت، علم، تفقہ شرط ہیں انمیں سے ایک بھی مرزا صاحب کی ذات میں موجود نہ تھا۔ علمی اور ذہنی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ معمولی قابلیت کے انسان تھے اور اسلامی تاریخ و تمدن سے قطعًا بیخبر بحثرت کے معارف و حکم یا احکام و مرویات سے انہیں کوئی خاص واقفیت نہ تھی اور چونکہ دنیائے اسلام کے جدید مسائل کا انہیں مطلق اندازہ نہ ہوا۔ لہٰذا ان کی سیرت کے متعلق گفتگو کرنا بیسود ہے بالفاظِ دیگر پروفیسر صاحب کے نزدیک

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

مرزا صاحب کا سارا سرمایہ اجتہاد محض تبلیغ اسلام اور بحث و جدل کی ہنگامہ آرائی ہے حالانکہ ان سے بہت پہلے اور خود انکی زندگی میں بزرگان اسلام نے زیادہ احسن طریق پر عیسائیت اور آریہ سماجی تحریک کی مناظرانہ رنگ میں تردید کی اور اشاعت اسلام تو گویا مرزا صاحب اور انکی جماعت کیلئے بے عملی کا سب سے بڑا عذر ہے۔ رہی مجددیت کی وہ بحث جسپر آجکل جماعت لاہور نے خاص طور سے زور دے رکھا ہے۔ سو یہ اسلامی تعلیمات سے اسقدر بعید فتنہ و فساد کا اتنا بڑا سبب اور تفریق بین المسلمین کا ایسا کارگر حیلہ ہے کہ اسکے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے۔ ہمیں امید ہے پروفیسر صاحب کا یہ رسالہ جو نہایت ہی سلیس انداز میں لکھا گیا، اور طعن و تعریض سے بالکل پاک ہے۔ غیر معمولی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

HIS HOLINESS

(Qadianism weighed in Balance)

BY

PHOENIX

With a foreword by M. Zafar Ali Khan

Price Rs. 3, postage extra.

KITABKHANA TULU'E-ISLAM,

25, McLEOD ROAD, LAHORE.

"RECONQUER INDIA FOR ISLAM"

THIS IS THE MESSAGE OF

"THE TRUTH", LAHORE,

A Weekly Journal of Religion, Politics and Social Reform,

Edited by the renowned Muslim Writer and Scholar

MR. F. K. KHAN DURRANI

Independent views, liberal policy, original, enlightened and revolutionary thought, non-sectarian, fearless in advocacy of Islam and the Muslim cause, the leader of new and newer thought in Islam and a most powerful organ of Islamic missionary propaganda. The **TRUTH** is the leading exponent of Islam in India and it is : : an education to read it regularly. : :

Yearly Subscription Rs. 4.

Apply for free specimen copy to :

The Manager, Tabligh Literature Co. Ltd.,

60, RAILWAY ROAD, LAHORE.

For High Class Urdu Literature

AND

BOOKS ON ISLAM

(URDU, ARABIC, ENGLISH)

Please write to :

KITABKHANA TULU'E-ISLAM,

25, McLeod Road, LAHORE.

red No. L3690. Telephone No. 3980.

ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہٗ کا تازہ مجموعہ

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف اور مسلمانوں کیلئے ایک نئی دعوتِ فکر

ضربِ کلیم چند ابواب میں منقسم ہے مثلاً

اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، فنونِ لطیفہ اور

محرابِ گل افغان کے افکار

جو فرزندانِ کوہستان کے لئے حیاتِ تازہ کا پیغام لائے ہیں

قیمت مجلد، دو روپے علاوہ محصول ڈاک

خاص جلد حسب فرمائش ڈھائی تین اور پانچ روپے

اور

بانگِ درا	جاوید نامہ	بالِ جبریل
تین روپے	تین روپے	تین روپے

اس کے علاوہ ہر قسم کی علمی ادبی کتابیں

کتاب خانہ طلوعِ اسلام، ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور سے طلب فرمائیے

(سول ایجنٹس ضربِ کلیم)

THE HOLY QURAN

TRANSLATION AND COMMENTARY BY

ALLAMA ABDULLAH YUSUF ALI

Being published in 30 parts

PRICE RE. 1 PER PART, POSTAGE EXTRA.

SAHIH-AL-BUKHARI

is now accessible to the English knowing world

Based on an intensive study of the Arabic language, early Islamic history and the Hadith-literature. With explanatory notes. The chain of narrators (Isnad) has been fully reproduced. An exhaustive index will be added to the end.

Printed on high quality antique paper with complete Arabic text in 30 parts of 120 pages each

BY

MOHAMMAD ASAD (LEOPOLD WEISS)

Subscription Rates:

Inland Rs. 2/8/- per part, postage extra.

Foreign Sh. 4/- ,, ,,

MEANINGS OF THE

GLORIOUS QURAN

being the English translation of the Holy Quran

BY

THE LATE MARMADUKE PICKTHALL

in collaboration with the Ulama of Egypt.

RS. 13/8/-

TO BE HAD OF:

KITABKHANA TULU'E-ISLAM,

25, MCLEOD ROAD, LAHORE.

طلوع اسلام

ایک ماہوار رسالہ مشتمل بر حیات ملیہ اسلامیہ

زیر ادارت سید نذیر نیازی

مدیر معاون سید نصیر احمد بی۔ اے

ستمبر ۱۹۳۶ء

جلد ۱ — عدد ۵

قیمت

فی پرچہ	ششماہی	سالانہ
آٹھ آنے	تین روپے	پانچ روپے

معہ محصول ڈاک

اشتہارات کے نرخ اور مزید تفصیلات کیلئے مہتمم سے خط و کتابت فرمائیے

مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور میں چھپا اور سید نذیر نیازی طابع و ناشر نے

دفتر طلوع اسلام ۔ ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

سے شائع کیا

بقائے صحت کے لئے ایک اچھی دوا

OKASA اوکاسا

دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے
اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں
اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں
اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال چڑچڑاپن ۔ نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو
جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے "اوکاسا" کا استعمال شروع کر دیجئے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے آزمائش کیلئے ۳۰ ٹکیاں چار روپے

اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیشہ تازہ اوکاسا
کی گولیاں استعمال کی جائیں ۔ اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبے پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں
اوکاسا کمپنی ۔ برلن (انڈیا لمیٹڈ) نمبر ۱۲ ریمپرٹ روڈ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۵ بمبئی

مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور

میں بیمہ زندگی کا کام نہایت کامیابی سے ہو رہا ہے

پنجاب و یو۔پی کے بڑے بڑے شہروں میں ایجنسیاں قائم ہو چکی ہیں

گارنٹی پر کام کرنے والے اصحاب تنخواہ پر ملازم رکھے جاتے ہیں

مسلمان خصوصیت کے ساتھ اس کمپنی کی طرف مائل ہو

رہے ہیں

چونکہ یہ ہندوستان کی واحد اسلامی بیمہ کمپنی ہے

اسلئے

ہر سمجھ دار مسلمان کو غیر مسلم کمپنیوں کے مقابلہ پر اس کمپنی کو ترجیح دینی

چاہیئے

مزید حالات

مینیجنگ ڈائرکٹر کمپنی ہذا سے دریافت کریں

شاہنامۂ اسلام

ہر دو حصص قیمت ۶ے

حضرت حفیظ جالندھری کی منظومات و غزلیات

اور ترانوں کا مشہور مجموعہ

سوز و ساز اور نغمہ زار

قیمت عا/ — قیمت ۱۲/

حفیظ کی دوسری نظمیں

سلام ۲/ — رقاصہ ۲/ — صبح صادق ۴/ — پردہ اور تعلیم ۲/

اور افسانے

ہفت پیکر اور **معیاری افسانے**

سات افسانوں کا دلکش مجموعہ قیمت ۱۲/ — یعنی دنیا کے اچھے اچھے اور مفید افسانوں کا مجموعہ قیمت ۱۲/

نقش چغتائی

خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کا شاہکار

قیمت پانچ روپے

مسدس حالی — مرقع چغتائی

صدی ایڈیشن قیمت ۱۲/ اور عا/ — قیمت بارہ روپے

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

کتاب خانۂ طلوعِ اسلام

ادارۂ ادبیاتِ ملّیہ

(نشرو اشاعت و تالیفِ کتب)

۲۵- میکلوڈ روڈ - لاہور

جنابِ والا!

آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ "کتاب خانہ طلوعِ اسلام" کے نام سے ادبیاتِ ملیہ کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کر دیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو کتابیں فی الواقعہ مفید اور پڑھنے کے لائق ہیں ان کے حصول و انتخاب میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ گویا کتاب خانہ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر "اشتہار یا کتاب فروشی" کی بجائے یہ امر ہے کہ ہم اپنے صحیح ادب سے روشناس ہو جائیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کی نوازشِ خاص سے اِس ادارے کو ابتدا ہی میں "ضربِ کلیم" ایسی نادر اور گراں قدر تصنیف حاصل ہوگئی۔ علامہ ممدوح کی عنایات کا یہ سلسلہ انشاء اللہ تعالیٰ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔ ان کی دو جدید مثنویاں "مسافر" اور "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" زیرِ طبع ہیں۔ آپ کی معارف پروری اور علم نوازی سے یقین ہے کہ اِس ادارے کی ہر طرح سے سرپرستی فرمائیے گا۔ کتاب خانہ طلوعِ اسلام کے متعلق پوری تفصیلات عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گزریں گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

مہتمم

آپ کے پڑھنے کی کتابیں

سرورِ دو عالم

پیغمبر اسلام صلعم کے مقدس سوانح حیات دلنشین پیرایۂ بیان میں قیمت عہ/

شمعِ شبستان

محترمہ ح ۔ ب صاحبہ کا مجموعہ کلام اردو ۔ قیمت عہ/

روحِ سیاست

محمد عمر نور الٰہی کا مشہور مزاحیہ ڈراما ۔ قیمت ۸/

انقلاب ۱۸۵۷ء

غدر دہلی کے حالات میں ایک انگریزی تصنیف کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ از شیخ حسام الدین بی اے

قیمت عہ/

انقلابِ فرانس

فرانس کے مشہور انقلاب کی مختصر تاریخ از جناب عبدالباری صاحب علیگ قیمت ۱۲/

ایم ۔ ایم اسلم کے دو مشہور ناول

مہدی
قیمت تین روپے

اور

طلسم سامری
قیمت عہ/

ہر قسم کی علمی ادبی مطبوعات کے ملنے کا پتہ

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

ترجمان القرآن

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ و تفسیر قرآن مجید

قیمت مجلد اوّل چھ روپے آٹھ آنے **مجلد دوم** سات روپے آٹھ آنے

قادیانی مذہب

پروفیسر الیاس برنی کی مشہور تصنیف

جس میں

قادیانیوں کے عجیب و غریب اعتقادات

پر خود ان کی کتابوں سے تبصرہ کیا گیا ہے

حجم ۹۶ صفحات قیمت تین روپے

شناخت مجدد

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مشہور مضمون

جواب

کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے اور

جسمیں بدلائل تبلایا گیا ہے کہ مجدد کیا

ہوتا ہے اور یہ کہ مرزا صاحب قادیانی اس منصب کے اہل تھے یا نہیں

ان کے علاوہ

قرآنِ پاک

حمائل شریف اور پارے

منقش۔ مطلا۔ سادہ۔ عکسی۔ مترجم۔ غیر مترجم

ہم سے طلب فرمائیے

کتاب خانہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

(سول ایجنٹس ضرب کلیم)